نوائے ادب

(ششماہی)

جلد ۴۵ : شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۵ ع

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲ ، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

انجمن اسلام

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مشاورتی مجلس

(بمبئی یونیورسٹی کے ضابطہ کے مطابق)

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

چیئرمین

جناب رضوان حارث

سیکرٹری

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

اراکین

جناب عبدالمجید ای پالکا — جناب عبدالستار رزی والا

پروفیسر اے اے قاضی — جناب عبدالعظیم کھنکٹے — پروفیسر ایس اے شیخ

مجلس عاملہ

صدر

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب رضوان حارث	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی
معتمد اعزازی	خازن اعزازی	شریک معتمد
جناب عبدالمجید ای پالکا	جناب یوسف دلال	جناب عبدالستار رزی والا

شریک خازن

جناب ایس اے قادری

اراکین

جناب سمیع خطیب	محترمہ زلیخا مرچنٹ	جناب سعید دادرکر
جناب احمد آر پیر محمد	جناب رضوان فاروقی	جناب عاری شیخ
جناب امین کھنڈوانی	پروفیسر عبدالقادر قاضی	جناب عبدالعظیم کھنکٹے

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے تا حال ڈائرکٹران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۴۷ سے ۱۹۶۸)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۵ سے جاری)

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

•

جلد ۴۵ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۵ ع

•

مندرجات

S/02

احوال واقعی

170691
16 10 97

۱۔ مخروح سلطان پوری کے اعزاز میں کل ہند اردو سیمینار

مجروح سلطان پوری نے اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل کے تعلق سے گذشتہ پچاس سالوں میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل تحسین ہیں اور اس ضمن میں انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کی ایما پر انکی خدمات کے اعتراف میں ایک کل ہند اردو سیمینار کا انعقاد انجمن کے بیر بھائی ہال میں ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب کی صدارت میں ۱۴ جنوری ۹۵ء کو عمل میں آیا۔

ڈاکٹر یوسف سرمست، صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) ڈاکٹر محمد مہدی دسنوی، سابق صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج (بھوپال) اور ڈاکٹر آدم شیخ، سابق صدر شعبۂ اردو، برہانی کالج (بمبئی) نے مجروح سلطان پوری کی شخصیت اور غزلگوئی کے تعلق سے بصیرت افروز مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر جمخانہ والا نے اپنی صدارتی تقریر میں مجروح کی غزلگوئی پر بڑے خوبصورت انداز میں (بقول شاعر) اظہار خیال یوں کیا ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے ہی گئے اور کارواں بنتا گیا

اور مجروح کی پچاس سالہ اردو خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ صاحب موصوف نے دراصل غزل کو غزل بنایا اور یہی انکی سب سے بڑی خدمت ہے۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے ڈائریکٹر پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر نے حیر مقدمی تقریر میں مجروح صاحب کی ادبی مساعی کا ذکر خیر کیا اور ہدیۂ مبارکباد پیش کی

صاحب صدر ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے انجمن کی جانب سے مجروح صاحب کی خدمت میں ایک سیمین طشتری اور شال پیش کی۔

مجروح صاحب نے اپنے بارے میں اور اپنی غزلگوئی کے سلسلے میں پر مغز جوابی تقریر کی جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف تھی۔ مہمان مقررین کی خدمت میں بھی شالیں پیش کی گئیں جنہوں نے اپنے مقالوں کی صورت پر مجروح کی غزلگوئی پر سیر حاصل بحث کی۔ یہ سیمینار شام میں عصرانہ کے بعد بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

۲۔ گوریکر صاحب تدریسی زندگی کے اکاون (۵۱) سال میں:

اس اردو سیمینار میں ڈاکٹر جمخانہ والا نے انجمن کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر گوریکر کی پچاس سالہ تدریسی زندگی اور انسٹی ٹیوٹ کی کوئی بیس سالہ اعزازی ڈائرکٹر شپ کا ذکر توصیفی انداز میں کیا اور شال پیش کر کے انکی قدر افزائی کی۔

۳۔ پروفیسر قاضی کی زیویرس کالج سے سبکدوشی:

پروفیسر اے اے قاضی، صدر شعبۂ سیاسیات، سینٹ زیویرس کالج (بمبئی) ماہ فروری ۹۵ ع کے اواخر میں کالج سے تقریباً پچیس (۲۵) سال کے بعد سبکدوش ہو گئے۔ ہماری خواہش ہے کہ اب وہ انجمن کے امور میں جس کی مجلس منتظمہ کے ایک فعال رکن ہیں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور انجمن کے صدر صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔

۴۔ غلام عباس دلال کی کتاب ’فارسی میں اخلاقیات‘ کا اجرا:

ہمارے جنرل سیکریٹری عبدالمجید پاٹکا صاحب کے استاد محترم اور بیک محمد ہائی اسکول (بمبئی) کے سابق معلم ڈاکٹر غلام عباس دلال کی کتاب بعنوان ’فارسی میں اخلاقیات‘ Ethics in Persian کی رونمائی ایران کلچرل ہاؤس کے ڈائرکٹر ایم اے معرد نے کی اور فادر جان الفنسو، سابق پرنسپل سینٹ زیویرس کالج نے صدارت کی۔ پروفیسر گوریکر اور پاٹکا صاحب نے دلال صاحب کی شخصیت پر اظہار خیال کیا یہ کتاب دراصل دلال صاحب کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسر گوریکر صاحب کی رہنمائی میں ترتیب دیا تھا۔

۵۔ ’عکس کوکن‘ اور ’مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور فن‘۔

اختر راہی جیسے کوکن کے ممتاز شاعر نے ’عکس کوکن‘ پیش کر کے کوکن کی ادبی، ثقافتی اور فنی پہلوؤں کو نہ صرف اجاگر کیا ہے بلکہ ایک بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ سردار جعفری صاحب نے اگر اپنے ’پیش لفظ‘ میں لکھا ہے کہ

انہیں کوکن کے ممتاز شاعروں میں شمار کیا جائے لیکن ہمیں یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ اختر صاحب کو ہندوستان کے مشاہیر نظم گو شعرا کی صف میں کھڑے کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر آدم شیخ نے عروج سلطان پوری اور ان کی شخصیت اور فن پر ایک بلند پایہ کتاب ترتیب دے کر ایک وبردست ادبی خدمت انجام دی ہے۔

دراصل اس کتاب کو عروج کی زندگی کی کہانی ان کی اپنی زبانی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

٦۔ ڈاکٹر علی محمد نار، آصف میاں صاحب اور پرنسپل سیمپسن۔

(الف) ڈاکٹر علی محمد نار انجمن اسلام کے ایک فعال رکن ہی نہیں بلکہ انجمن کے کاموں سے خصوصی طور پر حصہ لیتے رہے اور جامعات ہند کے اساتذہ اردو کی کانفرنس (منعقدہ ١٩٨٦ ع) میں جو انجمن اسلام کے زیر اہتمام ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی، مرحوم نار نے بلدیہ بمبئی کے ڈپٹی میئر کی حیثیت سے قابلِ قدر حصہ لیا تھا ان کی ناگہانی انتقال سے بمبئی کی سماجی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا کسی حد تک مشکل ہے ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(ب) صابو باغ ناگلہ (بمبئی) کے گرلز ہائی اسکول جو اب سیف طیب جی ہائی اسکول اور جونیر کالج کے نام سے موسوم ہے کی پرنسپل سیمپسن صاحبہ گذشتہ مہینے مختصر سی علالت کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں وہ ہائی اسکول کے آغاز سے سبکدوشی تک ایک مخلص سربراہ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتی رہیں تعزیتی جلسے میں اراکین منتظمہ، اور ادارے کی معلمات اور طالبات نے دل کھول کر نہ صرف انکی تعریف کی بلکہ اسکول کی ترقی کا ذکر کیا اور انکی روح کی تسکین کے لئے دعا کی ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں

(ج) انجمن اسلام کے ایک نوجوان مخلص کارکن جناب سید آصف میاں ایک دردناک حادثے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

(پروفیسر) این ایس گوریکر
(مدیر)

(جواہر الفقہ) پر ایک نظر

از

ڈاکٹر زبیر قریشی، گجرات یونیورسٹی، احمد آباد

قاضی نور الدین المتخلص بفائق مخزن الشعراء کے مشہور مصنف ہیں ان کی دو تصانیف اور بتائی گئی ہیں ایک ہے تحفۃ العرفان اور دوسری (جواہر الفقہ)

مولانا محمد نور الدین نے فارسی میں (جواہر الفقہ) پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ قابل غور ہے۔ انہوں نے مسلمانوں میں تعلیم و تعلم کے سلسلہ کے مفقود ہوجانے پر خون کے آنسو بہائے ہیں فارسی تو خیر ان کے زمانے میں معدودے چند افراد پڑھ بھی لیتے تھے لیکن عربی سیکھنے کا رواج شرفاء اور روؤساء میں بھی بالکل منقطع ہوگیا تھا علوم شرعیہ کیطرف سے تو گویا مسلمانوں نے آنکھیں ہی بند کرلی تھیں گاؤں گاؤں میں مدارس اور مکاتب کا جو نظام تھا وہ منقطع ہوگیا تھا یا مضمحل۔ چاروں طرف غفلت اور بے حسی کا دور تھا ان کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلے عربی پر جو انکو دسترس تھی گنوا دی اس کے بعد فارسی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اب اردو جیسی نعمت کو ضائع کررہے ہیں۔ اور یہ سب سو دیڑھ سو سال کے قلیل عرصہ میں ہوا دس پندرہ سالہ نیم کے درخت کو اگر آپ جڑ سے نکالنا چاہیں تو نہیں نکال سکتے الا بہ مشکل۔ عربی اور فارسی نے آٹھ سو سال ہندوستان میں ادبی اور علمی دنیا میں حکمرانی کی اور چشم زدن میں یوں غائب ہوئیں گویا کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا ہوا نے ذرا رخ بدلا اور آٹھ سو سالہ پرانے اور قدیم عربی و فارسی کے تناور درخت ریت کی دیوار ثابت ہوئے ہر چیز بتدریج مٹتی ہے مگر یہ قطرہ شبنم کیطرح طرفۃ العین میں منتشر ہوگئے جیسے کرکٹ میں ایک لمبی اننگ کھیلنے کے بعد یکے بعد دیگرے تین چار کھلاڑی پے در پے آؤٹ ہوجائیں، اسی طرح علوم متداولہ میں پہلے مسلمانوں کی دلچسپی کم ہوئی۔ یعنی فلسفہ، نجوم، ہیئت، رمل، جفر، مابعد الطبیعات، فلکیات وغیرہ کے جاننے والے کم ہوتے چلے گئے صرف علم طب سے آخر تک لگاؤ رہا۔ وہ بھی اس لئے کہ نواب اور جاگیرداروں کو مقویات کے لئے حکیموں

کی پرورش کرنے کا شوق تھا اس لئے نواب اور مسلم جاگیرداروں کیساتھ مطب اور طبیب بھی ختم ہوگئے اس کے بعد علوم شرعیہ سے غفلت کا زمانہ شروع ہوا۔ پرانے مخطوطات پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے۔ تفسیر و حدیث کے بجائے علما کو مناظروں میں دلچسپی تھی اور وہ بھی یہ کہ بہتر (۷۲) فرقوں میں سے کون سا ناجی ہے اور کونسا جہنمی البتہ اخیر تک شاعری اور ادب کو گلے سے لگائے رہے اب ہندوستان کے بعض صوبوں میں آزادی کے بعد سے وہ بات بھی نہیں رہی مسلمانوں کے دین و نظر کو دیمک لگ چکی تھی۔ لہذا انگریزوں کو انگریزی زبان کی حکومت مسلط کرنے میں اور عربی و فارسی کے استیصال میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی اپنے مقدمہ میں قاضی نور الدین نے وجہ ترجمہ بیان کرتے ہوئے اپنے اسی کرب کا اظہار کیا ہے خزانۃ الفقہ ابواللیث سمرقندی کی علم فقہ میں ایک کتاب تھی جسکو بہ حال مجبوری اور بادل ناخواستہ قاضی صاحب کو فارسی میں ترجمہ کرنیکی ضرورت پیش آئی تھی چوں کہ مسلمانوں میں عربی دانی ناپید ہوچکی تھی عربی سے فارسی میں منتقل ہونے والی یہ پہلی کتاب نہیں تھی متقدمین نے تراجم اس لئے کئے کہ بہر اپنی عالمیت کا لوہا منوانا تھا یہاں تو وجہ ترجمہ باعث قلق ہے اسی طرح آج اردو سے مقامی زبانوں میں تراجم ہورہے ہیں تاکہ اردو کو طاق نسیاں پر سجایا جاسکے۔ مقدمہ کا پہلا فقرہ کچھ یوں ہے:

> بر رای مہر انجلائے دیباچہ آرایان کتاب عقل و دانش و نقش پردازان صحیفہ خرد و بینش محتجب و مخفی نیست کہ چوں علمایان عالی نہاد و فضلایان و لا یزال در ترویج بر علم چہ قدر کوشش موفورہ و سعی مشکورہ بکار بردہ اند علی الخصوص در تالیف و تصنیف فقہ و حل مشکلات مقدمات و رموز کنایات و مہملات آں کہ تعلیم و تعلم او از واجبات بر ہر کس بقدر وسع و طاقت است اما در ایں زماں از باعث اختلال سلطنت اہل اسلام و ہرج و مرج آں و مروج شدن ممنوعات و منکرات و شائع گشتن مناہی و بدعات اکثر طبایع مسلمین از استحصال و استکمال علوم عربیہ کہ وقوف بر مسائل شرعیہ لازم بل الزم بر

سائر افراد مقلدان شریعت غراء محمدی است قاصرانه تا به حدی جهالت در مزاج شان از عـــدم وقوف احکام شریعت اطهر سرایت کرده که تکاسلی تمام و تمهیل تام در ادای اوامر و نواہی مرعی می دارند اگرچه اصحـاب سعادت کیش و ارباب حقیقت اندیش از سلف و خلف در ہر ازمنه خود در تسیهه اوامر و نواہی و اظهار حق و باطل پرداخته تالیف و تصانیف چه در عربی و چه در فارسی که ہر دو ہم قریب اند چنان که در اخبار واردات که لسان اہل الجنة العربیة و الفارسیة پس ہر قدر کوشش و سعی درباره دین از انسانی شود خالی از ثواب جزیل نه خواہد بود بقول علیه السلام من سن سنته فله اجرها ومن عمل بها چون در زمان ما اذہان زمانیان در تفهیم و تفہم علوم قاصر گشته اند و در تفتیش معیش بمرتبه تمام سمت گشمه که محروم از فواید می باشد سیما در انحصال علوم عربی که بنا بر تمادی زمان و عـدم قدر دانیش بسیار پہلوتہی اند بالجمله شرف و افضلیت علوم باعتبار موضوع است باتفاق علمائے کرام پس موضوع علم فقـــه مسائل دینی است و بر او اتفاق اصحاب حال و ماضی زمنه که این افضل و بهتر از ہمه چیز است پس علم او اشرف و اولی است ولله در من قال ع

علم دین فقـه است و تفسیر و حدیث

قاضی نور الدین صاحب نے مصرع ثانی نہیں لکھا جو اسطرح ہے ع

ہر که خواند غیر ازین گردد خبیث

یہی شعر اسی طرح گیارہویں صدی کے مخطوطات میں بھی ملتا ہے، غالباً یہ شعر مولانا سلیمان الکرد احمد آبادی کا ہے، یہ انکی اتباع (مثنوی رومی) میں لکھی گئی مثنوی (منبع الخیرات) سے لیا گیا ہے حیرت ہے کہ علم دین سے اس قدر شدید محبت اور غیر علم دین سے شدید بیزاری کے باوجود ایک زمانہ ایسا آیا کہ مسلمان علم دین سے بھی بے بہرہ ہوگئے اور دنیوی علوم سے بھی،

اس کتاب کا ترجمہ آپ نے ان کے عم بزرگوار قاضی محمد حسین الدین صدیقی کے ایما پر کیا تھا۔

«اما بر آں جلیل القدر جناب معلی القاب، کرامت مآب، عالی درجت، والا مرتبت، خلاصہ خاندان محمدیہ و نقاوہ دودمان عالیہ افضل اولاد جناب امیر المومنین ابی بکر الصدیق رض، قامع البدعہ والکفرۃ و الزندیق، مسند آرای شریعت غرا، زیب پیرائے ملت بیضا، مخدومی و مکرمی فیض بخش فیض رسان، رفیع الشان، عالی مکان، قاضی القضاۃ حضرت قاضی محمد حسین الدین خان صاحب مدظلہ العالی باین بندہ قلیل البضاعت خادم تراب اقدام سادات المدعو بہ نور الدین کہ ہیچ مدان کج مج زبان بانتساب قرابت ہمشیرہ زادگی بآں عالی جناب مفتخر و شرف اندوز است صادر گشتہ کہ اگرچہ ارباب متقدمین و متاخرین در ترجمہ کردن کتب عربی و فارسی مشتغل شدہ اند کہ یادگار ایشان بر صفحات روزگار باقی ماندہ است ؎

خوبان بادہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

اما بہ چاشنی حرزان مطالب شیریں ذائقہ و لذۃ لکلی شئ جدید مذاق دیگر حاصل است۔ لہذا کتاب (خزانۃ الفقہ) کہ در عربی تالیف فقیہہ ابو اللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ کہ بعبارت موجز جامع بر اکثر مسائل شرعیہ و حاوی مشتمل بر احکام عربیہ است اگر در فارسی ترجمہ کردہ آید سر یافتن مسائل مذہب ابو حنیفہ بر مقلدان سہل و آسان خواہد بود و خواص و عوام بہرہ وافی و حظ کافی خواہند برداشت و از دریافتن احکام مسائل ضروریہ کہ فرض عین و عین فرض است محروم و بے نصیب نہ خواہند ماند»

دراصل قاضی محمد نور الدین نے محض اس کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ بقدر

وسع اسکی تصریح و تشریح میں کوشش کی اور بعض موقعوں پر اجمال پر اکتفا نہ کرتے ہوئے شرح و بسط سے کام لیا اور اپنی صواب دید کے مطابق مجمل و مفصل بھی لکھا کہتے ہیں :

> «بقدر وسع فہم و طاقت در حل معنی لغات رعایت در ترجمہ موافق مدعا کتاب کردہ شد در بعض مقام کہ تفصیل کردن پر ضرور بود جرأت کردہ، چشم از فہمایان خرد پرور و صاحب انصاف و فصلایان دانشمند، دور از کج و اعتساف میدارد کہ اگر احیانا سہو و خطا بمقتضائے بشریت کہ لازمہ انسان است چنانکہ گفتہ اند الانسان مرکب من الخطا والنسیان بنظر عطوفت منظر بگذرد و از اصلاح و درستگیش ممنون فرمودہ مورد خطاب عتاب نکند.»

قاضی محمد نور الدین کے بارے میں کچھ مواد ملتا نہیں. لیکن انہوں نے «مخزن الشعراء»، «تحفۃ العرفان» اور «جواہر الفقہ» میں جو فارسی میں مقدمات تحریر کئے ہیں وہ گجرات میں انیسویں صدی کی فارسی نثر کے بہترین نمونے ہیں. انہیں یک جا کر کے انکو «مخزن الشعراء» کے آئندہ ایڈیشن میں شامل کرلینا چاہئے.

انہوں نے عالم کی جمع علمایان، فاضل کی فصلایان وغیرہ کہیں کہیں استعمال کیا ہے. غالباً اسطرح جمع کی جمع بنانے کا ہندوستانی طریقہ اسی صدی میں رائج ہوا ہوگا اس کی سب بڑی مثال مسلمانان ہے. مسلمان خود مسلم کی جمع ہے اسکی جمع ہم آج بھی مسلمانان کرتے ہیں. ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے فارسی اور عربی «ہم قریب» دراینں ہیں یہ لفظ انہوں ہم سایہ، ہم سفر وغیرہ کیطرح بنالیا ہے پھر ایک جگہ لکھا جہاں یہ «پر ضرور» معلوم ہوتی یہ سارے الفاظ اس بات کی علامت ہیں کہ ہندوستان کا ایران سے تہذیبی اور علمی رشتہ منقطع ہوچکا تھا اور فارسی پر مقامی اثرات کا سایہ دراز ہوتا جارہا تھا.

اس کتاب کو سید عنایت نے بمبئی کے اخبار برق خاطف کے مہتمم منشی میر مظفر حسین کے ذریعہ شائع کی تھی. سید عنایت علی کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا جسکی بنا پر اسکی طباعت میں تین سال کی تاخیر ہوئی انہوں نے طباعت کا کام کوئی دو صاحبوں کے سپرد کیا تھا یہ دونوں حضرات خود غرض

نکالے اپنا مطلب تھا تب تک کچھ کوشش کرتے رہے اور پھر غائب ہوگئے۔ غالباً مسودہ کیساتھ لہذا سید عنایت علی کو جوں توں کر کے دوسرا مسودہ بہم پہنچانا پڑا۔ وہ فرماتے ہیں۔

«چوں این کتاب مشتمل بر مسایل و فوائد کثیر و بعبارت موجز بود لہذا بندہ عاصی مملوک اہل بیت نبوی سید عنایت علی متوجہ بہ انطباعش شدہ اکثر از سہ سال در طبع او می کوشیدم و دو سہ صاحبان را تفویض کردم اوشان آنوقت مطلبی داشتند ساعی شدند چوں مقصد شان برآمد ہر یک از من روپوش شدند تا الی الآن باری چوں این حال بر این منوال دیدم تاسف خوردم سیما از گم شدن اصل کتاب۔ غرضیکہ بہرطور مسودہ دیگر بہم رسانیدم بہ مشقت تمام غرہ ماہ ذی قعدہ ..»

افسوس کہ آخری سطر مطبوعہ نسخہ میں ضائع ہوچکی ہے لہٰذا سنِ طباعت معلوم نہ ہوسکا

عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر جمع مکسر اور غیر عاقل ہوتو اسکی صفت واحد مونث آئیگی مثلاً اخلاق حمیدہ، آثار قدیمہ، مساعی جمیلہ وغیرہ وغیرہ۔ قاضی محمد نورالدین نے موصوف کو واحد استعمال کیا ہے مگر اسکی صفت واحد مونث لے آئے وہ فرماتے ہیں «کوشش موجوادہ» «سعی مشکورہ»۔ اس قسم کی تمام تراکیب کے نیچے خط کشیدہ ہے تاکہ انکی نشان دہی میں سہولت ہو۔

سید عنایت علی نے بھی انشان کو «اوشاں» لکھا ہے انیسویں صدی کے فارسی نثر کے اور نمونے دستیاب ہوں تو تقابلی مطالعہ سے پتہ چلے کہ ہندوستان نابید ہونے سے پہلے فارسی تحریر میں کیا تغیرات واقع ہوئے تھے۔

لہٰذا «جواہر الفقہ» بھی قاضی محمد نور الدین کی مستقل تصنیف نہیں جیسا کہ بابائے اردو عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔ علاوہ ازیں «جواہر الفقہ» کی طباعت کے بارے میں مرحوم عبدالحق نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی اختلاف ہوتا ہے۔ یا یہ کہ دونوں جگہ سے یہ نسخہ شائع ہوا ہوگا۔

● ● ●

قیام اورنگ آباد کے دوران مولوی عبدالحق کی تعلیمی خدمات

از

ڈاکٹر مسرت فردوس، گورنمنٹ کالج، اورنگ آباد

مولوی صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار مختلف مقامات پر گزرے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کی ابتداء پنجاب سے کی لیکن علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تلاش معاش کے لیے بمبئی گئے اور حیدر آباد میں ملازمت کی تعلیمی میدان میں دلچسپی اور ملازمت نے انھیں اورنگ آباد پہنچا دیا پھر کیا تھا اورنگ آباد کی سرزمین نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے اورنگ آباد سے دلی منتقل ہوگئے جب تک دلی میں رہے اردو کی ترقی کے لیے متفکر اور مصروف رہے لیکن تقسیم ملک کے حالات نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں وہاں جاکر نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔

یوں تو تمام عمر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو، کوشش اور جد و جہد کرتے رہے لیکن خاص طور سے اورنگ آباد کا زمانہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا زمانہ رہا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے تین اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ایک بحیثیت صدر مہتمم تعلیمات (۱۹۱۱ع سے ۱۹۲۳ع تک) دوسرے معتمد انجمن ترقی اُردو (۱۹۱۲ع سے ۱۹۳۸ع تک) اور تیسرے پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج (۱۹۲۳ع سے ۱۹۲۹ع تک)، دار الترجمہ عثمانیہ کی خدمات، عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری اور اردو لغت یہ ایسے کام ہیں جو حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن مولوی صاحب کی کام کی لگن اور ذمہ داری کے احساس نے حیدر آباد اور اورنگ آباد کے درمیان کے فاصلے کو کم کردیا تھا ان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ آباد سے حیدر آباد کی چکر لگاتے تھے لہذا ۱۹۱۱ع سے ۱۹۳۸ع تک کا زمانہ اورنگ آباد کا ہی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد بھی ۱۹۴۷ع تک ہر سال اورنگ آباد آتے رہے محمد علی کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> میں نے بے شک تم سب کو ہدایت کی تھی کہ اورنگ آباد نہ چھوڑنا لیکن زمانہ کا انقلاب ہے کہ پہلے مجھے ہی چھوڑنا پڑا مگر اس کی محبت اب تک میرے دل میں ہے سید ہاشمی کہا کرتے تھے اورنگ آباد کے قدر داں اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق۔ آگے لکھتے ہیں کہ:

> یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا بھلا کام جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا اس کا زیادہ تر حصہ اورنگ آباد میں بیٹھ کر کیا پھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں

مولوی صاحب علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری لے کر بمبئی روانہ ہوئے پھر حیدر آباد دکن آئے حیدر آباد میں مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس رہے یہاں رسالۂ افسر کی ادارت کی ہوم آفس کی مترجمی پر مامور ہوئے اس وقت مسٹر حیدری ہوم ڈپارٹمنٹ کے وزیر تھے کسی بات سے ناراض ہوکر مولوی صاحب نے حیدر آباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا، انہی دنوں میں میر سعادت علی نے ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات سے سفارش کی کہ مولوی صاحب کو محکمۂ تعلیم میں لیا جائے مولوی صاحب کا حیدر آباد سے اورنگ آباد آنے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ ریاست حیدر آباد کا ایک صوبہ میدک تھا گوبند رام صاحب کالے اس صوبہ کے مہتمم تعلیمات تھے گوبند رام کالے صاحب نے تین ماہ کی رخصت لی تو مولوی صاحب مہتمم بناکر بھیجے گئے۔ ۷ فروری ۱۹۱۱ ع کو مولوی صاحب نے مہتممی تعلیمات صوبۂ میدک کا جائزہ لیا۔ خطوط عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی میں درج ہے کہ محمد علی میدک میں اہل کار تھے کالے صاحب نے اپنی رخصت میں توسیع کرنی چاہی تو محمد علی کو خط لکھا کہ اطلاع دو کہ کتنی رخصت اور لی جاسکتی ہے لہذا کالے صاحب کی چھ ماہ کی رخصت منظور ہوئی اور چند دن بعد کالے صاحب کا تبادلہ اورنگ آباد ہوگیا اس لیے کارگزار مہتمم مولوی عبدالحق کو اورنگ آباد جانا پڑا لہذا ۱۹۱۱ ع میں مولوی صاحب اورنگ آباد آگئے۔

اورنگ آباد میں کام کی نوعیت، یہاں کی فضا اور یہاں کا ماحول مولوی

صاحب کے مزاج اور افتادِ طبع کے عین مطابق تھا چناں چہ اورنگ آباد کا قیام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا عہدِ زریں ثابت ہوا۔ یہاں تعلیم سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو ایک تحریک میں بدل دیا۔ مولوی صاحب ابتداء ہی سے فطرت کے حسین اور دلکش ماحول کو بہت پسند کرتے تھے۔ اورنگ آباد شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے باغوں کی کثرت ہے، جگہ جگہ حوض، فوارے، جھرنے خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں، زمین دوز نہروں کا انتظام ملک عنبر کا ہے ڈاکٹر سراج الدین کے مشورے پر مقبرہ رابعہ دورانی کو جسے اورنگ زیب نے تاج محل کے نمونے پر تعمیر کیا تھا رہنے کے لیے منتخب کیا یہ بڑا ہی خوب صورت اور پر فضا مقام ہے مکان مقبرے کے شمال مشرقی سرے پر احاطہ کی چار دیواری سے متصل تھا اس کے نصف حصہ میں مولوی صاحب کی سکونت تھی اور نصف میں انجمن کا دفتر تھا۔ مقبرے کی حسین عمارت کے پیچھے پہاڑیاں، دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں یہ علاقہ غیر آباد تھا۔ مولوی صاحب کو یہ مقام بہت پسند تھا یکم نومبر ۱۹۵۸ع میں کراچی سے ساجد علی کے نام خط میں لکھتے ہیں

> (اورنگ آباد کا وہ مقام جہاں میرا قیام تھا یعنی مقبرہ رابعہ دورانی اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی صاف ستھری ہوا، عنبری نہر کے لطیف پانی، اس کے دل ربا ماحول میں ایسی کشش تھی کہ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد بھی میں ہر سال کچھ دن وہاں بسر کرتا اسے اپنی صحت، توانائی اور مسرت کا ضامن سمجھتا اب بھی کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اورنگ آباد جاؤں اور چند روز مقبرے میں جاکر رہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسرت میرے ساتھ قبر میں جائے گی۔)

باغبانی سے آپ کو خاص دلچسپی تھی یہ شوق بھی یہاں پورا ہوا آپ حکومت کی طرف سے اس باغ کے اعزازی نگراں کار مقرر ہوئے

مولوی صاحب صوبۂ اورنگ آباد کی مہتممی تعلیمات پر فائز ہوئے تو اس زمانہ میں صوبہ کے چار ضلعوں کے لیے صرف ایک مہتمم تعلیمات مقرر تھا۔ مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے مراٹھواڑہ کے پانچ اضلاع اُن کے زیر نگرانی تھے۔

اسطرح اُنھوں نے ناندیڑ، بیڑ، پربھنی، اورنگ آباد ضلع کے تمام تعلقوں کا دورہ کیا۔ اردو اسکولیں قائم کیں اور اسکولوں کا معائنہ کیا۔ ابتداء میں زیادہ تر تحتانی مدارس تھے، جن میں چوتھی تک تعلیم ہوتی تھی گنتی کے وسطانیہ مدارس بھی تھے سر اکبر حیدری وزیر فینانس نے تو محکمۂ تعلیمات کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا ہر سال مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کام بڑھ جانے کی وجہ سے صوبے بھر کے لیے چار انسپکٹر آف اسکولس مقـــرر ہوئے اس زمانہ میں مولوی صاحب صرف ضلع اورنگ آباد کے مہتمم تعلیمات رہے۔ ۱۹۱۹ع سے مولوی صاحب صدر مہتمم تعلیمات بنائے گئے ناندیڑ، بیڑ، پربھنی اور عثمان آباد یہ تمام اضلاع کے مدارس اُن کے زیر نگرانی آگئے مولوی صاحب نے صوبۂ اورنگ آباد کے اضلاع کے علاوہ تعلقوں کے چھوٹے چھوٹے تحتانی مدرسوں تک کا دورہ کیا مولوی صاحب کا طریقہ تھا کہ پربھنی اور ناندیڑ کے دورے پر ٹرین سے جاتے مگر اورنگ آباد اور بیڑ کے تعلقوں کا بڑا دلچسپ دورہ کرتے ایک خوب صورت تانگا اپنے لیے رکھ لیا تھا۔ نوکر پیشہ لوگ بیل گاڑیوں میں ساتھ ساتھ چلتے تھے بعض مقامات پر آپ کو پیدل بھی جانا پڑتا تھا

حکومت عثمانیہ کی جانب سے ہر سال تعلیمی رپورٹیں شائع ہوتی تھیں ان تعلیمی رپورٹوں میں مولوی عبدالحق کے دوروں اور مدرسوں کے معائنے کے جدول پیش کئے گئے ہیں ان جدولوں کے مشاہدے و مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ع میں اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا چلا گیا مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے اُنھوں نے اردو تعلیم کی سب سے اہم تحریک چلائی اُس وقت تک اردو مدارس کا رواج عام نہیں ہوا تھا

صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے مولوی عبدالحق نے تعلیم کو عام کیا۔ مدرسوں کے معیار بڑھانے، قابل اساتذہ کا تقرر، طلبا کی صلاحیتوں کو پہچاننا، عسرت طلبا کی ضرورتوں کو رفع کرنا، دیہاتوں اور گاؤں میں تعلیم کی سہولت پہنچانے کے لئے حکومت سے نمائندگی کرنا، طلبہ کی فیس معاف کروانے اور سب سے بڑھ کر اردو تعلیم کے رواج کو عام کرنے کے لئے حیدر آباد ایجوکیشنل

کانفرنس میں موثر تقریروں کے ذریعہ سر اکبر حیدری اور سر راس مسعود کو اپنا ہم نوا بنالیا۔

مولوی صاحب چوں کہ طویل مدت تک محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہے تھے۔ لہذا وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ تعلیمی اداروں کا طرۂ امتیاز اس کے ذی علم اساتذہ ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے وحیدالدین سلیم کی وفات پر جو مضمون لکھا اس میں یہ نہایت اہم بات کہی ہے کہ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے۔ یہ ذوق معلم کی شخصیت، اس کے فنا فی العلم ہونے اور طالب علموں کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ ایسے معلمین مل جائیں جو اپنے آپ کو تعلیم کے لئے وقف کردیں۔ وہ اساتذہ کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُستاد کی اُس کے طالب علموں کے سامنے بے عزتی کرنے پر وہ انگریز آفیسر مسٹر مہیو سے ناراض ہوکر دورے سے واپس آگئے تھے۔

موثر طریقۂ تدریس اور اُصول فن تعلیم سے واقف کروانے کے لئے مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں اساتذہ کی ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن میں ایک مدرس عملی سبق دیتا دوسرے مدرسین اسے دیکھتے اور تنقید کرتے مولوی صاحب اپنی صدارتی تقریر میں اس سبق پر نکتہ چینی اور غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ مدرسے کی کتاب الرائے میں ہدایتیں لکھنے کے بجائے مولوی صاحب اساتذہ کو زبانی سمجھاتے تھے۔ اس طرح سے اساتذہ کو کھلے دل سے اپنے مسائل پیش کرنے کا موقع ملتا اگر مولوی صاحب کی کتاب الرائے میں لکھی ہوئی تحریریں ایک جگہ جمع کرلی جائیں تو وہ فن تعلیم اور علم و ادب کے لیے ایک بہت ہی مفید ذخیرہ ثابت ہونگی۔

مولوی صاحب کو اُصول تعلیم، تاریخ تعلیم اور نظامات تعلیم کی کتابیں پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ جب کبھی تدریسی مسائل کے سلسلہ میں مولوی صاحب سے کسی فنی کتاب کا ذکر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب نے وہ کتاب دیکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے مسعود جنگ ناظم تعلیمات حیدرآباد کی کتاب

نظم و نسق تعلیم جاپان کا اُردو میں ترجمہ کروایا۔

اُردو قاعدے کی ترتیب و تدوین مولوی عبد الحق کا قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔ مدرسوں میں اُردو کے مختلف قاعدے جاری تھے یہ طلبہ کی نفسیات کے مطابق نہ تھے مولوی صاحب نے طریق الصوت پر قاعدہ لکھوایا اور اس کی کلید بھی مرتب کروائی۔ اُردو قاعدے کے علاوہ پہلی جماعت سے لیکر ساتویں تک اردو کی سات ریڈریں تیار کی گئیں جو ریاست حیدر آباد کے مدارس میں رائج تھیں اور درسیۂ عثمانیہ کہلاتی تھیں اردو کا قاعدہ ۱۹۱۴ء میں اردو کی پہلی ریڈر ۱۹۱۶ء میں ترتیب پائی مولوی عبد الحق کی یہ خدمت قابلِ ستائش ہے یہ ریڈریں زبان و ادب کے ماہرین کے مشوروں سے تیار کی گئی تھیں اسباق اور مضمون کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر اور تعلیم کے اُصولوں و بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اردو زبان کے شہرہ آفاق ادیبوں، انشا پردازوں، ماہر فن شعراء کا کلام شامل کرکے طلبہ کو ان سے متعارف کروایا گیا۔ طلبا میں ادب کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنا ان ریڈروں کا مقصد تھا۔

مولوی عبد الحق کی دلی خواہش تھی کہ اورنگ آباد کے تعلیمی معیار کو جامعاتی سطح کی تعلیم سے وابستہ کیا جائے اگرچہ مولوی عبد الحق کی کوششوں کی وجہ سے شہر اورنگ آباد تعلیمی معیار کے اعتبار سے اعلیٰ مقام و مرتبہ کا حامل ہو گیا تھا لیکن شہریان اورنگ آباد کو صرف فوقانیہ درجہ تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت دستیاب تھی مولوی عبد الحق یہ چاہتے تھے کہ اورنگ آباد جیسے ادبی اور تعلیمی مرکز کو اعلیٰ تعلیم کا گہوارہ بنایا جائے جس کے لئے انہوں نے کوششیں شروع کیں اور یہ ارادہ کیا کہ شہر اورنگ آباد میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج کھولا جائے اگرچہ سرکاری سطح پر ہر قسم کی سہولت حاصل تھی لیکن اس عہد میں ایسی قدآور شخصیت نہیں تھی جو اس مقصد کی تکمیل کے لئے آواز بلند کرسکے۔ اسی لئے مولوی عبدالحق نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی جستجو سے ۱۳۳۲ف ۲۳-۱۹۲۲ء میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کی بنیاد رکھی سرکاری سطح پر اس کام کی بہت پذیرائی کی گئی اور مولوی عبد الحق کو اس کالج کا صدر مقرر

کیا گیا۔ تعلیمی یا علمی میدان سے متعلق یہ ان کی دوسری اہم ذمہ داری تھی ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۳ ع کو انٹرمیڈیٹ کالج کی ابتداء ہوئی، عبدالقوی دسنوی، محمد حبیب اللہ رشدی اور اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے شاگردوں مثلاً غلام جیلانی ہاشمی، عزیز الدین مغربی، شیخ احمد اورنگ آبادی سے ملاقات کرنے پر اُنھوں نے بتایا کہ اس وقت اورنگ آباد میں دو اسکول تھے ایک مدرسہ فوقانیہ اور دوسرا انگلش ہائی اسکول مدرسہ فوقانیہ کے صدر مدرس ملا شیخ داؤد تھے اور ہائی اسکول کے صدر ایس۔ آر۔ پیٹرک تھے ہائی اسکول کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا اور فوقانیہ کا تعلق سلطنت آصفیہ کے ڈائرکٹر تعلیمات سے۔ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوجانے کے باوجود اسکولوں اور کالجوں کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے رہا وہاں کے دونوں اسکولوں کو ملا کر ایک مڈل اسکول ایک انٹر کالج بنا دیا گیا جب کالج کی پہلی جماعت قائم ہوئی تو مولوی صاحب نے اپنے خرچ سے ان تمام طالب علموں کو جو اسی سال فوقانیہ کی تعلیم ختم کر کے جاچکے تھے واپس اورنگ آباد بلا لیا۔ مولوی صاحب کو اختیار دیا گیا کہ ان دونوں اسکولوں سے مناسب اساتذہ کو کالج میں لیا جائے اور اگر ضرورت ہوتو اساتذہ کو باہر سے بلائیں۔ مولوی صاحب نے لائق اساتذہ کو شمالی ہندوستان سے بلایا۔ مولوی صاحب کو طلبا سے اتنی محبت تھی کہ ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی شکایت برداشت نہیں کرتے تھے اور تو اور اس معاملہ میں اساتذہ کو بھی نہیں بخشتے۔ الٹے انھیں کو خطا وار ٹھہراتے اور کہتے کہ طالب علم کی غلطی تمہاری نا اہلیت کا ثبوت ہے۔

مولوی صاحب کو طلبا اور پروفیسر صاحبان کو کھانا کھلانے کا بڑا شوق تھا۔ جب بھی بورڈنگ کے لڑکوں کا دل چاہتا مولوی صاحب کے بنگلے پر چلے جاتے تھے۔ مولوی صاحب طلبا کے طعام کے لیے بہترین اور عمدہ انتظامات کرتے تھے اور اس کام میں انہیں دلی خوشی ہوتی تھی جس طالب علم کو بھی ضرورت مند دیکھتے فوراً روپیوں سے اس کی مدد کرتے تھے۔ طلبہ کو مولوی صاحب کی طرف سے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور انجمن کے ذریعہ بھی طلبا کی امداد کی جاتی تھی مولوی صاحب کی نگرانی میں کالج ڈے بڑے اہتمام

سے منایا جارہا تھا اس کی تیاریوں میں مولوی صاحب، طلبا، اساتذہ اور دوست احباب پوری دلچسپی اور توجہ سے مصروف رہتے تھے۔ ۲۴، ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۷ع کو مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا۔ ۱۲۶۱ع کا دلی کا آخری یادگار مشاعرہ پیش کیا گیا۔ یہ مشاعـــرہ اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسے میں شب کے وقت اسی شان سے کیا گیا جو اس زمانے کی تہذیب اور وضعداری کے شایاں تھا اس میں خاص طور پر یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر چیز اسی زمانے کی ہو اور ہر شاعر اسی حلیے اور وضع قطع میں آئے جو اصل میں تھی۔

طلبا کی علمی و ادبی پرورش کے لیے مولوی صاحب کالج سے ایک دو ماہی رسالہ ''نورس'' شایع کرواتے تھے ''نورس'' کا نام اُنھوں نے بیجاپور کے شاہی فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصنیف ''نورس'' سے مستعار لیا تھا ۱۹۲۵ع سے یہ رسالہ شروع ہوا اور انجمن کے مطبع میں چھپتا تھا

مولوی عبدالحق نے عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے عہدہ سنبھالنے کے بعد یہ کوشش جاری رکھی کہ طلبا کو صرف کتابوں کا کیڑا نہ بنایا جائے بلکہ اس کی ہمہ جہتی ترقی پر پوری توجہ مرکوز کی جائے یہی وجہہ رہی کہ مولوی عبدالحق نے طلبا کو لکھنے پڑھنے میں مشغول رکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں زائد از نصاب سرگرمیوں سے وابستہ کردیا

۱۲ جون ۱۹۲۸ع مہاراجہ سرکشن پرشاد کی آمـد پر ایک شاندار مشاعرہ کا انعقاد مقبرے میں کیا گیا اس کی منتخب غزلوں کا مجموعہ اور مشاعـــرے کے حالات محوی صدیقی نے تحریر کیے ہیں لکھتے ہیں کہ۔

''سرکشن پرشاد کی آمـد پر مولوی صاحب نے شاندار مشاعرے کا انعقاد مقـــبرے میں کیا۔ گرمی کی ٹھنڈی اور پُرکیف رات تھی۔ مشاعرہ ایک گول حوض پر کیا گیا تھا یہ حـوض بہت خوب صورت اور تقریباً دو فٹ گہرا ہے چاروں طرف خوش نما کنگـــورے بنے ہوئے ہیں۔ تمام حـــوض صاف و شفاف پانی سے لبریز تھا۔ تہہ آب

بالکل سفید مرمریں نظر آتی تھی کنگوروں کے درمیان میں جو خلا تھا ہر ایک میں پانی کے اندر مختلف رنگ کی برقـــی روشنی کے قمقمے آویزاں تھے۔ ہر ایک کا رنگ جداگانہ تھا ہوا کے جھونکے جب سطح آب کو خفیف جنبش دیتے تھے تو رنگین روشنیاں موجوں اور لہروں میں مل کر اپنی بوقلمونیوں کی عجیب بہار دکھاتی تھیں، چوں کہ آسمان چاندنی سے محروم تھا اس وجہ سے صاحبِ مشاعرہ کے جدت پسند دماغ اور ذوق سلیم و لطافت مذاق نے عجیب لطف سے اس کی تلافی کردی۔ مقبرے کے سرِفلک و کوہ پیکر گنبد پر سرچ لائٹ اس حسن سے ڈالی گئی تھی گنبد قلعہ نور نظر آتا تھا۔ مقبرہ کا مشاعرہ ۱۳ تیر کو ہوا اور ۵ تیر ۱۲۳۷ ف کو کالج کے اساتذہ نے مشہور و مقبول ڈرامہ "نکاح الحـــیر" دکھایا سرکشن پرشاد کے خیر مقدم کے لیے کالج کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا،

اکتوبر ۱۹۲۹ ع میں مولوی صاحب وظیفہ حسن خـــدمت پر سبک دوش ہوئے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوجانے پر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ حیدر آباد کی ملازمت کی وجہ سے اورنگ آباد کے علمی و تعلیمی میدان سے اُن کا تعلق نہ رہا لیکن انجمن ترقی اردو اور اورنگ آباد سے رابطہ قائم رہا اور دلی منتقل (۱۹۳۸ ع) ہونے تک ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

Edited by Prof. Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Pudlished by Mr Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008

«دفترِ پریشان» کے دو اہم نسخے

از

ڈاکٹر سید شاہد الحق چشتی، اجمیر شریف (راجستھان)

ناسخ لکھنوی سے جو دواوین منسوب ہیں، اُن کے تاریخی نام بالترتیب یہ ہیں۔

دیوانِ ناسخ (۱۲۳۲)، دفترِ پریشان (۱۲۴۷) اور دفترِ شعر (۱۲۵۴) دیوانِ ناسخ کی ترتیب ۱۲۳۲ھ میں عمل میں آئی اس کے تقریباً ۱۶-۱۵ برس کے بعد «دفترِ پریشان» مرتب ہوا ان دونوں دواوین کی ترتیب کے بعد ہی ناسخ کا تیسرا دیوان بھی اُن کی حیات میں ہی مرتب ہوگیا تھا جو «دفترِ شعر» کے نام سے جانا جاتا ہے «دفترِ شعر» کی ترتیب حیاتِ ناسخ میں ہونے کا ثبوت خود ناسخ کے درج ذیل اشعار سے فراہم ہوتا ہے۔ اور جو دیوانِ سوم میں ہیں سے

پھر کسی محبوبِ معنی فہم سے الفت ہوئی
پھر نیا دیوان ناسخ کا مرتب ہوگیا

تا بہ دیوان قیامت ہے، ہے یقین اے ناسخ
ہو نہ منسوخ یہ دیوان، خدا حافظ ہے

یہاں فی الوقت «دیوانِ ناسخ» اور «دفترِ شعر» کے اُن نسخوں کا ذکر مقصود نہیں جو ہند و پاک کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

ناسخ کی زندگی اگرچہ فارغ البالی میں گزری تھی مگر عمر کی آخری دہائی کا بیشتر حصہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر انہیں لکھنؤ سے باہر جلاوطنی کے عالم میں گزارنا پڑا اسی جلاوطنی کے عالم میں جو کلام ناسخ سے یادگار ہے اسے خود ناسخ نے «دفترِ پریشان» کے تاریخی نام سے مرتب کیا اس میں جلاوطنی سے قبل کا کلام بھی شامل ہے۔ اسی «دفترِ پریشان» کی ترتیب و تکمیل کے متعلق اختلاف رائے ہے

پروفیسر محمود الٰہی «دفترِ پریشان» کی ترتیب و تکمیل کے متعلق اپنے خیالات

کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں :

> «میرا خیال ہے کہ ناسخ نے ۱۲۴۷ھ میں یا تو دیوان کی ترتیب کا کام شروع کیا ہوگا یا دیوان مرتب کرلیا ہوگا۔ چونکہ اس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی اس لیے اس میں اضافہ کرتے رہے۔»[1]

فی الوقت اس سے بحث نہیں کہ ناسخ کے اس دوسرے دیوان کی ترتیب کب شروع ہوئی یا یہ کب مکمل ہوا۔ یہاں محض اس دوسرے دیوان کے اُن دو نسخوں کا تعارف مقصود ہے جن کا حوالہ اب تک کسی دوسرے ذریعہ سے سامنے نہیں آسکا ہے۔ اگرچہ سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر گیان چند اور مشفق خواجہ نے دفترِ پریشاں کے بعض مختلف نسخوں کا تعارف کرادیا ہے۔ اسی سلسلہ میں مشہور محقق و ادیب مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جنھوں نے «دفترِ پریشاں» کے نسخۂ رامپور کا تفصیلی تعارف رسالہ «تحریک» میں اب سے ۱۶-۱۵ سال قبل کرایا تھا۔[2]

ان اکابرین کی تحریروں سے اتنی بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ ناسخ کے دیوان دوم یعنی «دفترِ پریشاں» کی تاریخی اور لسانی اہمیت ہے۔ چنانچہ اسی احساس کے پیشِ نظر ذیل میں «دفترِ پریشان» کے دو ایسے نسخوں کا تعارف کرایا جارہا ہے جو محققین کی نظروں سے اب تک پوشیدہ رہے ہیں۔ یہاں اس طرف بھی اشارہ کردینا ضروری ہے کہ ان دو نسخوں میں ناسخ کے بعض ایسے اشعار بھی موجود ہیں جنھیں غیرمطبوعہ کلام ناسخ کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اسی قبیل کے بعض اشعار کا ذکر اس سے قبل مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر انصار اللہ صاحب اپنے مضامین میں کرچکے ہیں۔ لیکن جن دو نسخوں کا تعارف یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ ان میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جن پر

---

۱ بازیافت - پروفیسر محمود الٰہی، مطبع دانش محل، لکھنؤ ۱۹۶۸ع۔ ص ۱۰۴۔

۲ ملاحظہ ہو «تحریک» - نئی دہلی (سلور جبلی نمبر) جولائی تا اکتوبر ۱۹۷۸ع ص ۲۲ تا ۲۹۔

اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی ہے۔ لیکن پہلے ان مخطوطوں کا تعارف ضروری ہے۔ ان نسخوں میں پہلا نسخہ وہ ہے جو حیات ناسخ میں مرتب ہوا اور اب مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے مخطوطات سیکشن میں کٹیلاگ نمبر ۲۰/۷ کے تحت محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کی کیفیت درج ذیل ہے :

اس نسخہ میں ۱۴۵ صفحات ہیں۔ (صفحات کے نمبر بعد میں کسی شخص نے ڈالے ہیں۔ ہر صفحہ نمبر کے تحت ۲۰ کا ہندسہ مدارد ہے، جو صریحاً نمبر ڈالنے والے کی غلطی ہے) ہر صفحہ الف، ب پر مشتمل ہے۔ نسخہ نہایت شکستہ اور بوسیدہ حالت میں ہے۔ پہلا صفحہ سادہ ہے۔ صفحہ ۲ (الف) سے صفحہ ۱۴۲ (ب) کی تیسری سطر تک غزلیات ہیں۔ اس کے بعد رباعیات کا آغاز ہوتا ہے، جس کا سلسلہ صفحہ ۱۴۵ (ب) تک جاری ہے۔ نسخے کا آغاز صفحہ نمبر ۲ (الف) پر درج غزل کے اس مطلع سے ہوتا ہے ؎

خوب موزوں ہم سے وصف قد بالا ہوگیا
عالم بالا تک اپنا سول بالا ہوگیا

صفحہ ۱۴۲ (الف) سے آخری غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

ہر چند کہ ممکن ہی نہیں کان کے موتی
دیکھے ہیں مگر ہم نے تیرے کان کے موتی

(تعداد اشعار ۵)

صفحہ ۱۴۲ (ب) کی سطر ۴ سے رباعیات کا آغاز ہوکر اختتام صفحہ ۱۴۵ (ب) کی سطر ۸ پر ہوتا ہے۔ اس کے فوراً بعد ترقیمہ ہے، جو درج ذیل ہے :

(تمت تمام شد نسخہ دیوان ناسخ بخط خام شکستہ ارقام سید قلاب علی (؟) مالک موضع سرمں پرگنہ کودہ ضلع سارن واقع تاریخ سیوم ماہ جولائی ۱۸۳۸ء مطابق سی ام ماہ ربیع الاول ۱۲۵۳ ہجری ترقیم یافت۔ ه۔ ن)

اس نسخے میں غزلیات و رباعیات کی تعداد کے لیے کوئی نمبر نہیں تھے۔ راقم الحروف نے نسخے کی مائکرو فلم سے جو فوٹو حاصل کیے ہیں، اُس میں ہر غزل و رباعی کے نمبر علاحدہ سے ڈال دیے ہیں۔ جس کے مطابق اس نسخے میں مجموعی طور پر ۴+۲۳۷ غزلیات (چار غزلیں مکرر ہیں، جنکی تفصیل آگے آئے گی) اور ۵۴ رباعیات ہیں۔

اس نسخے کا غائر مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے میں، جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، چار غزلیات مکرر ہیں۔ جو کاتب کی لاپرواہی کی وجہ سے مکرر نقل ہوگئی ہیں، ذیل میں اِن غزلیات کے مطلعے لکھے جاتے ہیں اور قوسین میں اُن صفحات کے نمبر بھی دیے جاتے ہیں، جن پر یہ غزلیں درج ہیں ــــہ

(۱) لکھوں کیا حال میں دیوانہ اپنی ناتوانی کا
ہوا طوقِ گراں گردن میں وہ چھلا نشانی کا (ص ۸ ب و ۲۷ ب)

(۲) یاد آتی ہیں ہمیں یار تمھاری باتیں
ہائے وہ پیار کی آواز وہ پیاری باتیں (ص ۷۱ الف و ۸۴ الف)

(۳) سب کی سب کیا ہیں شبِ قدر، ہماری راتیں
کٹتی ہیں آنکھوں ہی میں ہجر کی ساری راتیں (ص ۷۱ الف و ۸۴ ب)

(۴) لوگ دنیا سے جو دن رات سفر کرتے ہیں
کوچ کی بےخبروں کو یہ خبر کرتے ہیں (ص ۸۲ الف و ۱۳۲ الف)

اب یہاں وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ جو اس نسخے کے حاشیوں پر اضافہ کیے گئے ہیں۔ جس کی بظاہر وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کتابت کرنے والے نے سہواً یہ اشعار نقل نہیں کیے ہونگے، لیکن جب کاتب یا مصنف یا مصنف سے خاص ربط رکھنے والے کسی شخص نے اس نسخہ پر نظرثانی کی ہوگی تو بعد میں یہ اشعار حاشیوں پر اضافہ کیے گئے ہونگے۔ حاشیوں پر اضافہ شدہ اشعار کا سوادِ خط اصل متن سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو اشعار حاشیوں پر درج ہیں اُن کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے ــــہ

(۱) کس قدر فرقت میں ہے ، میرا سیہ خانہ مہیب
شمع کے اڑ جانے کو ، شعلہ شہپر ہو گیا (ص ۵ الف)

(۲) مظہر وہ ذات ہے ، نورِ خدا کے ظہور کا
نقشِ قدم سے سنگ کو رتبہ ہے طور کا (ص ۱۰ الف)

(۳) تیری ایڑی سا اثر کاہے کو رکھتا ہے سہیل
گل سے بھی خوشبو زیادہ کفش کا گل ہو گیا (ص ۱۲ ب)

(۴) دشت جنوں میں شامِ غریبی کو دیکھ کر
آیا خیال مجھ کو خمِ گیسوئے یار کا (ص ۱۵ الف)

(۵) ہونٹھ میرے ہیں لبِ کاسۂ سائل کی طرح
حسن کا شاہ تو ہے ، میں ہوں گدا بوسے کا (ص ۲۳ الف)

(۶) نعرہ زن میں ہوں محفل[1] میں تو کہتا ہے وہ گل
آج بے بلبلِ نالاں ہے گلستاں اپنا (ص ۲۴ ب)

(۷) نیند آئے گی کہ موت آئے گی ہجرِ یار میں
دیکھیے کیوں کر ہوں اپنے دیدۂ بیدار بند (ص ۴۱ الف)

(۸) حال لکھا ہے جو میں نے بدنِ لاغر کا
لے اڑا نکلے کی مانند کبوتر کاغذ (ص ۴۵ ب)

(۹) اے فلک ! نشّہ جو قسمت میں نہیں غش ہی سہی
ہے غنیمت کبھی ہو جاؤں جو دم بھر بے ہوش (ص ۵۱ الف)

(۱۰) کیوں سراپا ہے سفید اے آتشیں رخسار شمع
کیا ہے تیرے عشق میں میری طرح بیمار شمع (ص ۵۴ ب)

(۱۱) ایسی نفرت ہے ، اگر خاک بھی ہو جاؤں میں
اڑ کے جاؤں نہ کبھی کوچۂ جاناں کی طرف (ص ۵۵ الف)

(۱۲) بوسۂ چاہِ زنخداں سے شفا ہو گی ہمیں

---

۱ (ہوتا ہوں) ۔ نسخۂ رام پور

کیا کریں گے اے طبیب اس تیرے مداوے کو ہم　　(ص ۵۷ الف)

(۱۳)　چشمۂ آفتاب کیوں نہ کہوں
تیرے چاہِ ذقن میں آب نہیں　　(ص ٦۰ الف)

(۱۴)　جینے کا گرمیِ تپِ غم سے گمان ہے
مدت سے جان میری، بدن میں رمق نہیں　　(ص ٦۷ ب)

(۱۵)　سب خلق کا خون تیری ہی گردن پہ ہے ساقی
یہ بوجھ اٹھاتی نہیں مردود کی گـــردن　　(ص ٦۹ ب)

(۱٦)　بو تری زلفوں کی جاتی ہے جو اکثر کان میں
میل ہوجاتی ہے رشکِ مشک عنبر کان میں　　(ص ۷۲ الف)

(۱۷)　بادشاہی جوش نہیں آتی تو شاہوں کی طرح
تین دن کو اے فلک! کیا چاہیے نوبت ہمیں　　(ص ۷۷ الف)

(۱۸)　مے کـــدہ درفتِ ساقی میں سیہ خانہ ہوا
نظـــر آتا ہے مجھے ساغـــرِ بلور سیاہ　　(ص ۹۵ ب)

(۱۹)　نہ ہوا لبریز مرا ساغرِ عمر
کر گیا میں قدحِ زہرِ ہلاہل خالی　　(ص ۱۰۵ ب)

(۲۰)　لکھتا ہوں وصفِ مژگاں، ترکش ہوا قلمدان
نوکِ قلم ہے پیکاں، باقی قلم سری ہے　　(ص ۱۱۳ ب)

(۲۱)　برشکال آتے ہی مے ڈھونڈھنے ہم دور چلے
آبلے دشت میں ہیں، شہر میں انگور چلے　　(ص ۱۲۴ ب)

مندرجہ بالا تمام اشعار نسخۂ رام پور (جس کا تعارف مولانا عرشی کرواچکے ہیں،) کے متن میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں درج ذیل رباعی کے اول دو مصرعے متن میں اور آخری دو مصرعے رباعی کے طرز پر حاشیے پر لکھے ہوئے ہیں ـــــ

آتا ہے کبھـــی جو مجھ کو حـــظِ جاناں
ہوتا ہے زیادہ دل کو رنجِ ہجـــراں

پڑھتا ہوں جو خط ، بہتے ہیں اشک آنکھوں سے
تاثیر میں دودۂ مرکب ہے دھواں

صفحہ نمبر ۹۹ پر ذیل کے اشعار کے مصرع اول/دوم حاشیے پر نقل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ کاتب نے نقل کرتے وقت ایک شعر کے پہلے مصرعے کے سامنے بعد کے شعر کا مصرع ثانی سہواً لکھ دیا ہوگا ۔ لیکن جب کاتب کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا ہوگا تو اس نے ان اشعار کے مصرع اول و ثانی حاشیے پر لکھ کر ان مصرعوں پر نمبر ڈال دیے ۔ مثلاً ذیل کے اشعار کی یہی کیفیت ہے ۔ متن میں ایک شعر کا پہلا مصرع لکھا ہے ع

بیداریاں جو ہیں شبِ فرقت کی دوستو

اس مصرعے کے سامنے (متن میں) بعد کے شعر کا مصرع ثانی لکھ دیا گیا ہے، جو یہ ہے ع

صورت نہ دیکھوں ہجر میں اسبابِ وصل کی

بہرحال ان اشعار کی صحیح کیفیت اس طرح ہے ۔

(۱) بیداریاں جو ہیں شبِ فرقت کی دوستو
(۲) تعبیر مل رہی ہے مجھے خوابِ وصل کی
(۳) مینا و جام و شمع کو پھینکو یہاں سے دور
(۴) صورت نہ دیکھوں ہجر میں اسبابِ وصل کی

اب یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مذکورہ اشعار میں اول الذکر شعر کا مصرع ثانی اور آخر الذکر کا مصرع اولی (مصرع نمبر ۲ و ۳) حاشیے پر درج ہیں۔

زیرِ نظر نسخے کے متعدد اشعار میں ترمیمات بھی کی گئی ہیں ۔ اور ترمیم شکلیں حاشیوں پر لکھی گئی ہیں ۔ ذیل میں چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں، جن کے الفاظ میں تبدیلی کی گئی ہے ؎

(۱) تیرے آگے نظــــر آتا یہ خورشید سیاہ
که مری عقل میں جز خال لب بام نہیں (ص ۶۱ ب)

مندرجہ بالا شعر کے لفظ «لب بام» کو بدل کر حاشیہ میں «سیہ فام» لکھا گیا ہے ــــہ

(۲) اے پری رو! تیری زلفوں کے تشابہ کے لیے
اب تو صیاد بھی رنگواے لگے جال سیاہ (ص ۹۲ ب)

اس شعر کے لفظ «زلفوں کے» پر نسخے کا «ن» لکھکر حاشیہ پر مرمم شکل «زلفوں سے» لکھا گیا ہے ــــہ

(۳) دولت حدار سے پاتے ہیں شہرت صاف دل
آئینوں میں ہے سکــــدر کا نمودار آئینہ (ص ۹۴ الف)

اس شعر میں لفظ «حدار» کی جگہہ «سردار» کو درست کیا گیا ہے۔

(۴) اسی طرح صفحہ ۱۳۰ (الف) پر یہ شعر ــــہ

ــــہ امید وصل میں ہم جھولتے ہیں برسوں سے
وہاں رقیب ہیں، طیاریاں ہیں جھولوں کی

اس شعر میں لفظ «رقیب ہیں» پر «بدلہ» لکھکر حاشیے پر «رقیبوں میں» لکھا گیا ہے۔

اس نسخہ میں کم از کم چار اشعار ایسے ہیں جو صرف اسی نسخہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور باقی معلــــوم نسخوں مثلاً نسخۂ رام پور، نسخۂ ندوۃ العلماء، نسخۂ گورکھپور، نسخۂ انصار اللہ نطر اور مطبوعہ کلیات و دواوین ناسخ میں یہ اشعار ندارد ہیں۔ ذیل میں درج ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ناسخ کی زبان اور اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ الحاقی کلام نہیں ہوسکتا ــــہ

(۱) سمجھے ہم، کرتے ہیں تیری یاد اے رویاے حسن
کان میں آتے ہیں جس دم نالۂ شبگیر موج (ص ۳۴ ب)

لطمے جو کھائے ہیں مرے دریائے اشک کے
مثلِ خمِ سپہر ہے، محور جس کمود (ص ۴۲ الف)

دیکھ زاہدا اس کو کہتے ہیں نمازِ ناروا
سر پٹک آتا ہوں چھپ کر یار کی دیوار سے (ص ۱۴۰ الف)

پھر جاناں میں نہیں ہیں پاؤں، مر گئے بھی نہیں
کام کیا ہم کو بھلا پابوس سے دستار سے (ص ۱۴۰ ب)

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، اس نسخہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ ناسخ میں ہی ضبط تحریر میں آچکا تھا نیز اس کے حاشیوں پر اضافہ اور الفاظ کی ترمیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نسخے پر کتابت کے بعد ان بھی کی گئی ہے اور یہ کام ممکن ہے مصنف یا کاتب یا کسی ایسے شخص یا ہوگا جو ناسخ سے خصوصی ربط رکھتا ہوگا۔ اس مخطوطے کی ایک بات ں ہے کہ اس کا متن تقریباً نسخۂ رام پور سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن نسخۂ ر کے مقابلے میں کم از کم ۸۰ غزلیات/فردیات اس میں کم ہیں۔ تاہم نسخۂ ر کے برعکس اس نسخے میں رباعیات بھی مرقوم ہیں۔ اور ترقیمہ بھی واضح پر لکھا ہوا ہے، جو اوراق گذشتہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔ اس نسخہ کے ، ۱۳، ۱۷، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۴۳، ۶۶، ۶۷، اور ۶۸ ، شکستہ اور بوسیدہ حالت میں ہیں ان اوراق کو بٹر پیپر لگا کر محفوظ کرنے کی ں کی گئی ہے اس کے باوجود کرم خوردگی کی وجہ سے دوسرے اوراق بعض سطریں کچھ الفاظ بھی متاثر ہورہے ہیں۔ کرم خوردگی اور آب رسیدگی وجہ سے نسخے کا کاغذ نہایت شکستہ اور پیلا پڑ گیا بہرحال اس حالت کے بود بھی یہ نسخہ ناسخ کے «دفترِ پریشاں» کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ راقم سروف نے ناسخ کے «دفترِ پریشاں» کو مرتب کیا ہے۔ ترتیبِ متن میں اس نسخے کو بھی قدیم مآخذ کے طور پر استعمال کیا ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ حیاتِ ناسخ کا نسخہ ہے اور ۱۲۵۳ھ میں کتابت ہونے کے باوجود اس میں ناسخ کے دیوانِ سوم (دفترِ شعر) کی ایک بھی غزل یا شعر نہیں

ہے۔ اس اعتبار سے زیرِ نظر نسخہ کو خالص (دفترِ پریشان) کا نسخہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ نسخۂ علی گڑھ کے علاوہ ناسخ کے (دفترِ پریشان) کے ایک اور قلمی نسخے کی عکسی کاپی راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے، یہ نسخہ راقم الحروف کو استاد محترم ڈاکٹر فیروز احمد کی معرفت حاصل ہوا تھا اس نسخے کے متعلق اطلاع ہے کہ اب یہ مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اس سے قبل یہ نسخہ جے پور کے ایک تاجرِ کتب کی ملکیت تھا یہ بھی ناسخ کے (دفترِ پریشان) کا ایک اہم نسخہ ہے۔ اس نسخہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نسخۂ علی گڑھ کی طرح ہی مردف ہے اور تاریخی ترتیب پر مبنی ہے۔ یعنی اس نسخے کی غزلیات کی ترتیب نسخۂ گورکھپور (جس کا مفصل تعارف پروفیسر محمود الٰہی نے (بازیافت) میں بھی کرادیا ہے۔ [1]) کے مطابق ہے۔ ذیل میں اس نسخے کی کیفیت مع دیگر خصوصیات درج کی جاتی ہیں۔

نسخۂ مذکورہ ۱۲۶۶ ھ کا مکتوبہ ہے۔ مخطوطہ مردف اور اچھی حالت میں ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کاتب نے ہر غزل میں تخلص اور (وله' منه) کے الفاظ سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ نسخہ نہایت اہتمام سے خوشخط لکھا گیا ہے۔ رسم الخط قدیم ہے۔ یعنی قدیم املا کی خوبیاں جیسے بعض مقامات پر نقوط کا حذف، گ پر محض ایک مرکز لگانا۔ یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کرنے کے علاوہ اعراب بالحروف کا استعمال کرنا، یعنی پیش کی جگہہ واو کا استعمال کرنا، الفاظ کے درمیان میں ہمزہ کا عام طور پر حذف کرجانا، آخری نون غنہ میں ہمیشہ نقطہ لگانا وغیرہ وغیرہ۔

یہ نسخہ ۳۵۶ اوراق پر مشتمل ہے نسخے کے شروع اور آخر کا ایک ایک ورق سادہ ہے۔ جس پر کوئی نمبر نہیں ہیں نسخے کے ایک ورق کو چھوڑ کر دوسرے ورق پر ترک کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ اس نسخے میں ردیف ط، غ اور ہ کی غزلیات ندارد ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

۱ ملاحظہ کیجیے (بازیافت) ص ۱۰۱ تا ۱۳۸۔

بعد ازاں جز بندی کے دوران ان ردیفوں پر مشتمل غزلیات کے اوراق سہواً نکل گئے ہیں جسکی مثال یہ ہے کہ ورق ۲۲۲ پر ترک کا لفظ (دیکھیے) لکھا ہوا ہے لیکن ورقِ آئندہ کی شروعات لفظ (ابرو) سے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اوراق کی ترتیب صحیح ہے۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ اوراق پر نمبر غالباً جز بندی کے بعد ڈالے گئے ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، اس نسخے میں اوراق کی تعداد ۳۵٦ ہے ہر ورق ۱۵ سطری مسطر پر مشتمل ہے پہلے ورق پر بسم اللہ کے بعد حمد و غزل درج ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ـــــ

اقرار نبوت میں ہے اقرار خدا کا
انکار امامت میں ہے انکار خدا کا

غزلیات کا سلسلہ ورق ۳۲٦ کی سطر ۱۲ تک ہے۔ اس کے بعد رباعیات کے عنوان سے رباعیات کا آغاز ہوتا ہے اور اختتام ورق ۳۳۴ کی سطر ۷ پر ہوتا ہے اس کے بعد قطعات تاریخ کا آغاز ہوتا ہے جس کا سلسلہ ورق ۳۵٦ کی سطر ۱ تک ہے۔ اس کے فوراً بعد ترقیمہ ہے ترقیمہ کے الفاظ کرم خوردگی اور آب رسیدگی کی وجہ سے واضح نہیں ہیں، پھر بھی یہ الفاظ صاف طور پر پڑھے جاسکتے ہیں۔

(عطیہ کنـــور سروپ سنگھ . . وقط (؟) ۹ (؟) تاریخ ۱۴ اپریل ۱۸۴۹ ع بروز دو شنبہ (؟) مطابق ۱۲٦٦ ھ فصلی در ماہ چیت تحریر کردہ شد . تحصیلے نواب گنج ساکن حوالی ضلع بریلی، جہان آباد)

نسخۂ زیر نظر میں غزلیات کی تعداد ۳٦۸، فردیات ۳، تعدادِ رباعیات اردو ۵۰، تعدادِ رباعیاتِ فارسی ۲، تعداد قطعات ۵۹ (اس نسخے میں دیوانِ اول کے دو قطعات، دیوان سوم کے ۸ قطعات اور کم از کم دو قطعات تاریخ ایسے بھی ہیں جن سے انتقال ناسخ (۱۲۵۴ ھ) کے بعد کے سنہ برآمد ہوتے ہیں جو غور طلب بھی ہیں اور جن پر الحاق کا بھی شبہ ہوتا ہے۔ متن کے اعتبار سے یہ نسخہ، نسخۂ

رام پور، نسخۂ علی گڑھ اور نسخۂ ندوہ سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ یعنی مذکورہ نسخوں کی طرح اس کی متعدد غزلوں میں ایک سے زائد مطلعے ہیں جو غزل کے آغاز میں مسلسل ہونے کے بجائے غزل کے درمیان میں لکھے ہوئے ہیں اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نسخۂ زیر نظر مصنف کی اصل بیاض یا اس کی نظر کردہ مخطوطہ کی نقل ہے۔ جس سے دیگر مطلعے بے ترتیب جوں کے توں نقل ہوگئے ہیں۔

اس نسخہ میں مندرجہ محض ایک شعر دو جگہ نقل ہوگیا ہے ـــــہ

کم نہیں مار سیہ سے رہبر زلفِ یار کا
کان کا موتی ہوا چھالا دہانِ مار کا

یہ شعر پہلی جگہ ص ۴۳ پر غزل کے مطلع کے طور پر اور دوسری جگہ ص ٦۲ پر غـــــزل کے درمیان نقل ہوگیا ہے۔ جو ممکن ہے سہوِ کاتب ہو۔ اسی طرح اس نسخے میں محض ایک جگہ ص ۱۱۳، پر مندرجہ شعر کے ایک لفظ کو حاشیہ کے لفظ سے تبدیل کیا گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ـــــہ

بحر میں سوجاؤں کیا میں توشاک کمخواب پر
بن گئے ہیں بال پلکوں کے مرے خواب پر

مذکورہ شعر کے لفظ "توشاک" کی جگہ حاشیہ پر لفظ "توشک" لکھا گیا ہے۔ اور یہی مروج صورت دیگر قلمی نسخوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس نسخے میں کم از کم دو اشعار ایسے ہیں جو دیگر نسخوں اور مطبوعہ کلیات و دیوانِ دوم میں نادرد ہیں (البتہ ممکن ہے یہ اشعار نسخۂ گورکھپور میں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ گورکھپور اس نسخے سے مطابقت رکھتا ہے۔) اشعار کی زبان و اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی کلام ناسخ ہی ہے۔ یعنی اسے الحاقی کلام نہیں کہا جاسکتا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ـــــہ

رونے دو، روتا ہے اُس گل کی تمنا میں اگر

رہنے دو شبنم اگر گل چشم دشمن میں نہیں　　(ص ۲۰۹)

مرضِ عشق نے یہ حال بنایا میرا
گور کی آکے مری روز خبر لیتا ہے　　(ص ۲۹۳)

مذکورہ دونوں نسخے ناسخ کے "دفترِ پریشاں" کی غزلوں وغیرہ کے تعین میں اہمیت رکھتے ہیں اب یہاں "دفترِ پریشاں" کے بعض ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں، جو صرف ناسخ کے دیوانِ دوم کے مختلف قلمی نسخوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان کی طرف کسی دوسرے کی نظر نہیں پڑی، لہٰذا یہ اشعار بطور غیر مطبوعہ کلام کے ذیل میں آتے ہیں وضاحت کے لیے ہر شعر کے سامنے اُس نسخہ کا نام (مخفف) درج کیا جاتا ہے، جن میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ ـــــہ

(۱)　ہوا جو مے کشی و بحر سے جگر پر داغ
بہانے مے یہ ضرور آبِ لالہ زار آیا
(نسخۂ رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۲)　ہوں وہ مے کش، میرے مرتے ہی ہوا ساقی فقیر
ترکِ دنیا کرکے مینا، شاہ مینا ہوگیا　　(ایضاً)

(۳)　مے گل رنگ یہاں، اور وہاں آب سپید
ہے جدا پیرِ مغاں، زاہدوں کا پیر جدا　　(رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۴)　کم نہیں ہے کم نہیں ہے وہ مرتاض جاجیوا
قد خمیدہ، صورتِ محراب ہوگیا
(رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۵)　طالع خوابیدہ کا دیکھو اثر
قصۂ ناسخ، کہانی ہوگیا　　(رام پور، ندوہ)

(۶)　ہر گل عارض ہوا ہے داغ تیرے رشک سے
خط نہیں، پھاہا لگا ہے مرہم زنگار کا　　(رام پور)

(۷)　کیا میسر خمار میں ہو شراب

نہ مجھے تشنگی میں آب ملا (رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۸) ترکِ دنیا کے سوا گوہرِ مقصود کہاں
دیکھو آبادی سے رہتا ہے سمندر باہر (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۹) اغیار سے غرض نہ کسی یار سے غرض
رکھتا ہوں ہر کسی سے ملاقات بے غرض (رام پور)

(۱۰) ننگ رکھتا ہو جو خط کے نام سے
کیا لکھے مجھ کو وہ گل رخسار خط
(رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۱۱) ہو رہے ہیں ہر طرف روشن چراغ ماہی
گردشِ مینا ہے، ہر حابۂ شب تار شمع (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۱۲) کف تار سیہ ہے، شمع کا شعلہ نہیں
ہے شب تار جدائی میں، نہ رنگِ مار شمع (ایضاً)

(۱۳) ہوش رمیدہ ہوں نہ حواس پُریدہ ہوں
وحشت میں، میں صدائے گلوئے بُریدہ ہوں (ندوہ)

(۱۴) شب فراق میں کہتا ہے کیا دلِ بیتاب
بڑا غضب ہے کہ وہ درد انتظار نہیں (رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۱۵) ایک بوسہ لبِ شیریں کا لیا ظلم ہوا
کہہ گئے تلخ مجھے تم کئی باری ناہیں (رام پور، ندوہ)

(۱۶) کیا خیالِ نرگس خاماں میں رویا ہے کوئی
بیشتر پیدا جو ہوتے ہیں کنول تالاب میں (رام پور)

(۱۷) رچ رہی ہے بو جو تیرے جسم کی اے رشکِ گل
موتیوں کے ہار گویا موتیا کے ہار ہیں (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۱۸) شاخِ گل سے ہیں جو اس غیرتِ شمشاد کے ہاتھ
باغ سے داغ ہی آیا دلِ ناشاد کے ہاتھ (ایضاً)

(۱۹) کفِ افسوس لگا ملنے جو میں دیوانہ
یاد آئے کسی محبوبِ پری زاد کے ہاتھ (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۲۰) بھاگتا ہے تو لگائے لیے جاتا ہے مجھے
یار اقرار بھی ہے، غمزۂ انکار کے ساتھ (ایضاً)

(۲۱) فکر میں سوجھے یہ مضمون، آہ آتش بار کے
آتش آئینۂ زانوں نظر آیا مجھے

(رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۲۲) نظر آئے مجھے مردوں سے زیادہ نامرد
جس جگہ دور کسی کا وہ چلے زور چلے (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۲۳) بحر میں مصرعے دہن سے آشنا
جائے شاعر، شاعرانہ سیارہ ہے (رام پور، ندوہ، علی گڑھ، جے پور)

(۲۴) گل گوں! اگر بھگاؤ مجھے قتل کر کے تم
مثلِ غبار جوں مرا ساتھ اڑا چلے (ایضاً)

(۲۵) دشمن مرے کلام کو سن کر ہلاک ہوں
منہ میں عوض زبان کے، شمشیر چاہیے (رام پور، ندوہ، علی گڑھ)

(۲۶) قاصد اگر کوئی نہیں ملتا تو کیا ہوا
ہیں اس کی کا بکوں میں کبوتر بھرے ہوئے (ایضاً)

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ نسخۂ رام پور میں ایک قطعہ بھی ہے جو ہمارے خیال میں ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس لیے کہ یہ قطعہ کسی دیگر قلمی نسخے یا مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے اور وہ جو بعد ازاں مرتب شدہ انتخاباتِ کلام ناسخ میں ہے۔ یہی حال نسخۂ رام پور اور نسخۂ جے پور میں موجود ایک رباعی کا بھی ہے لہٰذا ذیل میں یہ قطعہ اور رباعی بھی درج کی جاتی ہے۔ تاکہ کلام ناسخ کی تفہیم میں مدد مل سکے۔

قطعہ .

الوداع اے گشتِ غربت الوداع
الوداع اے دشت کربت الوداع
اے سکوں، اے پائے پرحوں، اے سکوں
الوداع اے حوشِ وحشت الوداع
الرحیل اے یاس و حرماں، الرحیل
الوداع اے رنج فرقت الوداع

رباعی :

بحر اخضر میں جو تجھ پر ماہ تاباں ڈوب جائے
چاہ کنعاں میں نہ کیوں کر ماہ کنعاں ڈوب جائے
آگیا ہے یاد وہ سروِ خراماں باغ میں
اس قدر روؤں کہ ہر سروِ گلستاں ڈوب جائے

*

مودبانہ التماس

(۱) قلمکاروں سے استدعا ہے کہ وہ ''نوائے ادب'' کے لئے ایسے تحقیقی مضامین بھیجکر ممنون کریں، (۲) اردو اکادمیوں کے سربراہوں سے اپیل ہے کہ وہ اس تحقیقی جریدہ کو اپنے حلقہ کی لائبریریوں اور تعلیمی اداروں کو اپنی اکادمی کی جانب سے بھیجکر اردو کی سرپرستی کریں اور (۳) اردو دوستوں سے التماس ہے کہ وہ ''نوائے ادب'' کا سالانہ چندہ ارسال کر کے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیکر شکریہ کا موقع عنایت کریں .

(پروفیسر) نظام الدین ایس گوریکر
(مدیر)

اورنگ آباد بعہد آصفیہ
اور
اردو نثر کا آغاز و ارتقا

از

ڈاکٹر طیب انصاری
گورنمنٹ کالج آف آرٹس، گلبرگہ (کرناٹک)

نواب میر قمر الدین خان فتح جنگ، نظام الملک آصفجاہ اول نے ۱۷۲۴ع میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور دکن میں سلطنت بہمنیہ کی طرح ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا وجود عمل میں آیا اس ہی سلطنت آصفیہ کا دار السلطنت اورنگ آباد قرار پایا. اورنگ آباد تقریباً (۱۷۲۴ع تا ۱۷۷۰ع) نصف صدی تک مملکت آصفیہ کا دار السلطنت رہا اور یہ نصف صدی بیشتر جنگ و جدال، استحکام سلطنت اور اطاعت و بغاوت کا شکار رہی تاہم اُردو زبان و ادب کے اعتبار سے تاریخ میں اپنی جداگانہ شان بان رکھتی ہے اُس کی بنیادی وجہ سلاطین آصفیہ کی علم پروری اور امراء و وزراء کی علم دوستی ہے چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف سید سلیمان نے کیا ہے. لکھا ہے

> "آصفی خانوادہ کی بنا ایسے مقدس بزرگوں کے ہاتھوں سے پڑی ہے جن میں فضل و کمال اور زہد و اتقا کی فضیلتیں یکجا تھیں پھر ترکستان سے ہندوستان آکر ان اوصاف گرامی کے ساتھ تدبر و سیاست کا عنصر بھی اس میں شامل ہوگیا. آغاز دیکھا جائے تو اس کی نسبت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتی ہے اور اوسط پر غور کیا جائے تو خانوادہ سہروردیہ کی بزرگی اوس کو حاصل ہے. اور آخر پر نگاہ کی جائے تو نظام الملک کا سلسلۃ الذہب رشحو عقیدت ہے ؎
>
> این سلسلۂ طلائی ناب است
> این خانۂ تمام آفتاب است" [1]

---

[1] حیات آصف مولفہ محمد محبوب جنیدی، ص ۱ ۲، ۳.

عظیم الدین محبت قیام سلطنت کے بارے میں لکھتے ہیں :

«اٹھارویں صدی میں سلطنت آصفیہ کی تاسیس تہذیب دکن کے عروج کا منتہیٰ ہے ۔ جب مغـــل شہنشاہیت کا قصر رفیع متزلزل ہوگیا تو نظام الملک آصفجاہ نے دکن کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ۔[1]

چنانچہ یہ جو مملکت عالم وجود میں آئی کوئی چھوٹی سی ریاست نہیں تھی بلکہ مشتاق احمد خان کے الفاظ میں وہ ایک عظیم مملکت تھی جو اپنے رقبہ، آبادی اور وسائل اور معیاری علم و سبق کی بنا پر بہت سی آزاد مملکتوں کا ہم پلہ سمجھی جاسکتی تھی ۔[2] چنانچہ اگر ہم اسکے نقشہ پر نظر ڈالیں تو شمال میں ملاس پور ، ناگپور ، برہان پور اور سورت ، جنوب میں تنجور ، ترچناپلی ، کوئمبتور اور مشرق و مغرب میں بحر ہند اور بحرۂ عرب تک پھیلا ہوا علاقہ بوقت اعلان خود مختاری (۱۷۲۴ ع) حدود مملکت میں شامل تھا ۔ تہذیبی نقطۂ نظر سے حیدر آبادی تہذیب ، ہندوستانی تہذیبوں کا نقطۂ اتصال اور ایرانی ، ترکی ، عربی تہذیبوں کا سنگم تھی ۔ یہاں تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں ایک سلیقہ تھا رکھ رکھاؤ تھا ، نکھار تھا ، رچاؤ تھا ، جاذبیت تھی ، کشش تھی اور وہ کھرانیت تھی جس کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے سے افراد کشاں کشاں چلے آتے ۔ »

دولت کا یہ عالم کہ اپنے زمانے میں ہیروں کی سرزمین کی حیثیت سے دنیا کی سب سے بڑی دولت مند مملکت سمجھی جاتی تھی ۔ شاہان دکن کی شان و شوکت کے قصے تو بہت مشہور ہیں مگر امراء بھی کچھ پیچھے نہ تھے ۔ مملکت آصفیہ (ص ۴۴) میں سر آسمان جاہ کا ایک واقعہ لکھا ہے ۔ سر آسمان جاہ نے مـــیر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی دعوت کا اہتمام کیا تھا ۔ شہ نشین کی طرز کا ایک چبوترہ بناکر اس پر قالین بچھا دیئے گئے تھے اور مہمانوں پر کھانے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ ختم دعوت پر آسمان جاہ نے حضور سے عرض کی کہ یہ چبوترہ اشرفیوں سے بنا ہوا ہے نذر میں پیش ہے ۔ قبول ہوا ۔ اشرفیوں کے چبوترے پر دسترخوان بچھانے اور معزز مہمانوں کو ساری اشرفیاں نذر کردینے کا یہ واقعہ

---

۱ - ۲ مملکۂ آصفیہ ص ۳۱ ، ۱۴ ، مرتبہ ادارہ محبان دکن ، کراچی (پاکستان)

تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے۔

حکومت کا استحکام اور دولت کی فراوانی نے مملکت آصفیہ کو رشک جنت بنا دیا تھا چنانچہ آصفجاہ اول باوجود اس کے کہ وہ ہمیشہ پابہ رکاب رہتے اور جنگ و جدال سے فرصت نہ ملتی تھی اس کے باوجود علم دوستی اور علم پروری کے لئے مشہور تھے اور دکن میں سیاسی اعتبار سے ایک مستحکم اور پائیدار مملکت کی بنا ہی نہیں ڈالی بلکہ ایک ایسے تمدن کی آب یاری بھی کی جو آگے چل کر دکن ہی سے مخصوص ہوا عبد المجید صدیقی[1] نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں تمدن کے تین بڑے مرکز ہوئے ہیں پہلے دہلی نے تمدن کو سنوارا اور ایسا سنوارا کہ اس کے گلی کوچے بھی اوراق مصور ہوگئے اور یہ تحریک دہلی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کی زمین دور لہریں دور دور تک پھیلیں اور بالآخر اٹھارویں صدی میں لکھنؤ اس کا روکش ہوگیا انیسویں صدی میں حیدر آباد نے زندگی کی نئی راہیں دریافت کیں اور تمدن کو ایسا شگفتہ بنایا کہ اس کے سامنے ہندوستان کے تمام سماج پھیکے پڑ گئے۔" تمدن اور تہذیب کی ترقی یوں ہی نہیں تھی۔ اس ایوان تمدن کا جو معمار اولین تھا وہ معلم تہذیب کا پروردہ اور حاشیہ بردار بھی تھا اور بقول حکیم شمس اللہ قادری "نواب آصفجاہ اول عالم فاضل تھے۔"[2] عبد الجبار ملکاپوری نے آصفجاہ اول کے بارے میں لکھا ہے۔[3]

> "جب آپ عالم شباب میں علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہوگئے اور بزرگان سلف کی طرح معقول و منقول و فقہ و اصول میں ایسی لیاقت و مہارت حاصل کی کہ اقران و امثال سے فایق و لایق ہوئے تقریر و تحریر میں بے نظیر تھے عربی و فارسی و ترکی و ہندی زبان میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ فاضل ادیب و عالم لبیب تھے۔ ہر ایک زبان میں نظم و نثر لکھنے میں ملکۂ تامہ و مدرکۂ کاملہ رکھتے تھے۔"

---

۱ مملکۂ آصفیہ، ص ۳۳۳ ۲ رسالہ ادیب، اپریل ۱۹۱۰ ع، ص ۵۵۔

۳ محبوب الزمن، ص ۸۔

آصف جاہ خود بھی شاعر تھے آصف اور شاکر تخلص تھا مشہور فارسی شاعر بیدل سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ انہوں نے بیدل کو دکن آنے کی دعوت دی۔ مگر بیدل نے آنے سے انکار کیا اور جواب میں شعر لکھ بھیجا ؎

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

آصف جاہ کی ادب نوازی اور علم پروری کا شہرہ عام تھا وہ خود بھی شاعر تھے اور نثر نگار بھی اور ساتھ ہی اہل علم کے قدر داں بھی تھے۔ چنانچہ ان کی قدر دانی کا شہرہ سن کر عرب، ماوراء النہر، خراسان، عراق، عجم اور ہندوستان کے علما اور فضلا اور مشائخ دکن آئے۔[1] اسی دور میں شیخ نظام الدین اورنگ آبادی تشریف لائے۔ آصف جاہ اول حضرت کے مرید و معتقد تھے چنانچہ آپ نے حضرت نظام الدین ولی کے ملفوظات کو احسن الشمائل کے نام سے مرتب کیا۔ آصف جاہ اول اُردو شعر و نثر سے بھی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ ڈاکٹر زور نے مرقع سخن (ص ۳۰) میں ایک شعر نقل کیا ہے ؎

گالی نہ کہو کوئی مرے دلبر کو حسد سے
مجھ دل کے گلے میں یہ دعائے یمنی ہے

نثر میں آصف جاہ اول نے اپنا ایک تاریخی وصیت نامہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔[2] جو انہوں نے اپنے آخری وقت میں اپنے لڑکے نواب ناصر جنگ کو بٹھا کر لکھوایا تھا۔ اردو نثر میں یہہ شہ پارے سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ آصف جاہ اول کے عہد میں اردو نثر کی دو کتابوں کا پتہ ملتا ہے۔

۱۔ معرفت السلوک کے بارے میں احمد آصفجاہی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب شاہ ولی اللہ قادری خلف حبیب اللہ قادری کی تصنیف ہے ۱۱۵۰ ھ (۱۷۳۷ع) سے پہلے یہ کتاب تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں تصوف سے بحث کی گئی ہے۔ اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔[3]

---

۱ حیات آصف مولفہ محبوب حسینی۔ ۲ عہد عثمانی میں اردو خدمات مولفہ احمد آصفجاہی، ص ۵۔ ۳ بحوالہ دکن میں اردو، ہاشمی، ص ۴۳۔

۲- اخلاقِ ہندی: اس زمانے کی نثر کا دوسرا نمونہ اخلاقِ ہندی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ یورپ میں موجود ہے۔[۱]

آصف جاہ اول کے وزیر صمصام الملک صارم تخلص کرتے تھے اور اردو شاعری سے انہیں دلچسپی تھی۔ ان کے ایک اور وزیر محمد ہاشم خوافی خاں مورخ کی حیثیت سے مشہور تھے۔ منتخب اللباب تین جلدوں میں (۱۱۳۰ھ) میں تصنیف ہوئی[۲] لالہ منسا رام پیشکار صدارت کے عہدہ پر فائز تھے اور نثر نگار کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ میر غلام علی آزاد، نواب امین الدولہ، علامہ میر عبدالجلیل، قزلباش خاں اُمید، رضی الدین اقدس، مرشد قلی خاں مخمور، مرزا خان رسا، فضل علی خاں صولت، عاشق علی خاں ایماء، عارف الدین عاجز، غضنفر حسین غضنفر، اور مرزا داؤد دامنِ آصفی سے وابستہ تھے

ویسے تو اُردو ادب کی ابتداء تمام تر شبہات کے باوجود عہد بہمنیہ کے ممتاز بزرگ حضرت بندہ نواز گیسو دراز (گلبرگہ) سے منسوب تحریرات کو قرار دیا جاتا ہے جن کی وفات ۸۲۵ھ میں ہوئی تھی تاہم یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان ہی کی طرح شعر و نثر کی تحریک شمال ہی سے داخل دکن ہوئی تھی اور عہد بہمنیہ میں حضرت میاں محمود انصاری اولین نثر اور شاعر کی حیثیت سے دریافت ہوتے ہیں ہم سقوط گولکنڈہ تک کے اردو ادب کو دکنی ادب سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طرح اگر جدید اُردو ادب کی ابتداء کی تحقیق کریں تو پتہ چلتا ہے کہ شاہ ولی قادری (معرفت سلوک) ہی کو اولین نثر نگار قرار دیں گے۔ کیونکہ شمالی ہند میں ابھی اس کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ احتشام حسین شمالی ہند میں اُردو کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں[۳]:

"اردو ادب کی مروج تاریخوں میں اردو کی ابتدا بھی محمد شاہی

۱ بحوالہ اردو شہ پارے، زور، ص ۳۲۴۔　۲ جامعہ، جلد ۱۲، شمارہ ۳، ۴، ڈاکٹر زور، ص ۱۷　۳ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ مرتبہ احتشام حسین، ص ۷۹۔

عہد (۱۷۴۸ع - ۱۷۹۱ع) ہی سے مانی جاتی ہے۔ اور سب سے پہلی کتاب فضلی کی کربل کتھا قرار دی گئی ہے۔ فضلی کا نام فضل علی تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب ۱۷۳۱ع مرتب کی پھر خود ہی ۱۷۴۸ع - ۱۱۶۱ھ میں اس میں ترمیم کی۔،

اس طرح فضلی کی کربل کتھا ۱۷۴۸ع - ۱۱۶۱ھ کی قرار پاتی ہے جبکہ شاہ ولی اللہ قادری کی تصنیف ۱۱۵۰ھ منصۂ شہود پر آئی۔ احتشام حسین نے ایک دلچسپ بات یہ بھی کہی ہے کہ فضلی کا وطن دکن ہی تھا لکھتے ہیں : دکنی علماء نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ فضلی بھی جنوبی ہند کے رہنے والے تھے۔ کیونکہ کچھ محاورے ان کے یہاں بھی وہی ملتے ہیں جو دکنی اُردو میں پائے جاتے ہیں۔، آگے چل کر وہ مزید کہتے ہیں "مگر اسے کوئی قطعیت بخش ثبوت نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا اسلوب دکنی اہل قلم کے اسلوب سے مختلف ہے۔ اگر وہ دکن کے باشندے ہوتے تو انہیں وہاں کی تصنیفوں اور ترجموں کا علم ضرور ہوتا۔، بہرحال فضلی دکنی ہوں یا ہندوستانی وہ اولین نثر نگار نہیں کہلائے جاسکتے تاہم یہ صحیح ہے کہ چند برسوں کے فرق کے ساتھ اس دہے میں اردو نثر ملک کے مختلف حصوں میں عام ہورہی تھی چنانچہ احتشام حسین کی تحقیق کے مطابق "سودا نے میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کو بھی نثر میں منتقل کیا مگر اب اس کا مسودہ بھی دستیاب نہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کہانی لکھتے وقت سودا کس طرح کی نثر تخلیق کررہے تھے۔،[1] صوبۂ بہار میں شاہ عماد پھلواروی کی نثری تصنیف سیدھا راستہ (۱۶۷۰ع) ظہور کے رسالہ نماز، اور محمد اسحاق کے رسالہ معینہ کو ضرور اہمیت دینا چاہئے۔ پھر شمالی ہند میں میر حسین عطا تحسین نے اُردو کو "نو طرز مرصع" بخشا ادھر دکن میں یہی زمانہ ہے جبکہ مذہبی علوم کے علاوہ تاریخی واقعات اور عوامل ادب کا حصہ بن رہے تھے اور تاریخ نویسی علم ہوچلی تھی۔ اور آصفجاہ اول کے دربار میں جہاں وجیہ الدین وجدی، اور میر قمر الدین، منت موجود تھے اور جہاں من لگن کے مصنف قاضی محمود

۱ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۸۰۔

بحری (گوگی شریف) بھی اس دور میں زندہ تھے وہیں منشارام اور میر غلام علی آزاد جیسے نثر نگار بھی موجود تھے

آصف جاہ ذی علم بھی اور علم کے قدر داں بھی جنگ و جدال اور امور مملکت سے انہماک کے باوجود علما کے ساتھ وقت گذارتے چنانچہ محمد محبوب جنیدی کے مطابق ، نواب مغفرت مآب ظہر کی نماز کے بعد عموماً حدیث نبوی سماعت فرماتے تھے عصر سے مغرب تک کا وقت ارباب علم و فن کی مجالست کے لئے مختص تھا اس وقت علماء، صلحاء و شعرا جمع ہوتے تھے اس مجلس میں یا تو علمی مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں یا شعر و سخن کا مشغلہ رہتا تھا ،[1] آصفجاہ اول نے جہاں اپنے جانشینوں کو جہانگیری و جہاں بانی کی تلقین و ہدایت کی اور اس کے گر سیکھائے وہیں انہوں نے اپنے صاحبزادے ناصر جنگ کو یہ وصیت بھی کی۔[2]

> « این ہمہ مردم کہ ہر ایک بلا تفاوت جواہر پارہ ایست بے بہا لطف و عنایات جمع کردہ ایم ، در ہیچ حال قدر اینہا از دست بدادہ وست و صحبت اینہا برداشت نمودہ بیکار ندارد و بکار لایقہ مامور سازند۔»

نواب میر احمد علی خاں ناصر جنگ شہید صرف چار سال کے لئے برسر اقتدار رہے لیکن اس مختصر سے عرصہ میں علم و ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے ۔ اور بقول ڈاکٹر زور ان کی بارگاہ اہل علم و فضل کا ماویٰ و ملجا تھی۔[3] انہیں شعر و سخن کے علاوہ مصوری اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ فارسی کے علاوہ اردو اور سنسکرت سے بھی آگاہی رکھتے تھے وہ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے چنانچہ متعدد تذکروں مثلاً ریاض حسنی ، چمنستان شعراء اور مختلف بیاضوں میں ان کے اردو شعر نقل ہیں۔ فارسی کے تین دیوان شائع ہوچکے ہیں ۔ اکثر و بیشتر آپ کے دربار میں شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں ۔[4]

اس عہد کے شعراء میں سراج، آزاد، محرم، عاصی، قہر، فضلی، ایما اور

---

۱ ، ۲ حیات آصف مولفہ محبوب جنیدی، ص ۳۹۵ و ۳۹۶ ۔ ۳ مرقع سخن، ص ۳۰ ۔ ۴ عہد عثمانی میں اردو خدمات مولفہ آصفجاہی ، ص ۹ ۔

ناشرالامرا کے مصنف صمصام الدولہ شاہ نواز خان قابل ذکر ہیں۔ ناصر جنگ نے عاشق علی خان ایما کو پانچ سو روپیہ منصب سے سرفراز کیا تھا اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی مقرب خاص تھے۔ نقد علی خان ایجاد مرزا خان رسا وغیرہ ناصر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ صمصام الدولہ ناصر جنگ کے وزیر تھے ان کا نام عبدالحی خان اور تخلص صارم تھا اپنے وقت کے مشاہیر شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے ان کی نسبت لکھا ہے۔ « در علوم و فنون شعر گوئی و شعر فہمی از امرائے عصر انتخاب بود۔ »[1] خود اس دور میں غلام علی آزاد نے اپنی « مجلس » کے ذریعہ اورنگ آباد کو شعر و سخن کا گہوارہ بنا دیا تھا. وہ اپنی ذات میں انجمن تھے اور ان کی ذات سے کئی تشنگان علم و ادب مستفیذ ہورہے تھے۔ وہ صاحب تصنیف بھی تھے الضو الداری اور سبحۃ المرجان ان کی تصانیف ہیں۔ سبحۃ المرجان کا اردو ترجمہ مظہر آدم کے نام سے مولوی شمس الدین ۱۸۷۸ ع میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ غزلان ہند، فی ذکر الہند، ید بیضا، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، مآثر الکرام اور روضۃ الاولیا آزاد بلگرامی کی ایسی تصانیف ہیں جو اس دور کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں

عبدالجبار ملکاپوری[2] نے محبوب الزمن میں آزاد کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

« میر غلام علی نام آپ کا مسقط الراس محلۂ میدان پورہ واقع قصبہ بلگرام صوبۂ اودھ ہے آپ کی ولادت باسعادت پچیس تاریخ ماہ صفر روز یکشنبہ ۱۱۱۶ھ میں واقع ہائی آپ کی نسب کا سلسلہ حسنی موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین سے منتہی ہوتا ہے۔ چنانچہ خود آزاد نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے

گرچہ باشد موتم الاشبال عیسیٰ جد من
عیسیٰ جان بخش شیرانم، بدار نفس من

آزاد نے « خزانۂ عامرہ » میں لکھا ہے کہ « میری تحصیل پانچ اساتذۂ کرام

---

۱ رسالہ ادیب از شمس اللہ قادری، ص ۳۵۔

۲ محبوب الذمن مولفہ عبدالجبار ملکاپوری، ص ۲۵۵۔

سے درجۂ تکمیل کو پہنچی۔ اول مولانا میر طفیل احمـــد بلگرامی قدس سرہٗ سے کتب درسیہ پڑھیں۔ دوم علامۂ زمان میر عبـــدالجلیل سقی اللہ السلسبیل سے نعمۂ حدیث و سیر نبوی و فنون ادب حاصل کیا۔ سوم بحر مواج علوم میر سید محمـــد خلف علامہ مرحوم سے عروض و قوافی و فنون ادب تکمیل کی۔ چہارم صاحب آیات بینات مولانا شیخ محمد حیات سندی روح اللہ سے مدینہ منورہ میں صحیح بخاری کی سند و صحاح ستہ و سائر مفردات کی اجازت حاصل کی۔ پنجم جامع کمالات شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے مکہ معظمہ میں بعض فوائد علم حدیث اخذ کیا۔ تحصیل علوم و فنون ہونیکے بعد ۱۱۳۰ھ میں حضرت قدوۃ العارفین سید لطیف بلگرامی قدس سرہ العزیز سے بیعت حاصل کی۔ انتہیٰ کلامہ (ص ۲۵٦، ۲۵۵)۔

آزاد بلگرامی بتاریخ ۱۵ جمادی الاول ۱۱٦۴ھ شہر اورنگ اباد میں آئے اور چند روز تک شاہ مسافر کے تکیہ میں آزادانہ رہے۔ آزاد جامع کمالات تھے اور شعر گوئی و شعر فہمی کی استعداد خدا داد تھی۔ اور بقول عبدالجبار ملکاپوری عہد کے بعد آپ ہی ایک ایسے بزرگ ہیں کہ تذکرہ نویسوں میں مقدم و مستعد مانے جاتے ہیں۔ تاریخ و تذکرہ نویسی میں قدرت کاملہ و ملکہ تامہ رکھتے تھے۔

حضرت آزاد اورنگ آباد کی تہذیبی اور ادبی زندگی کے روح رواں تھے اور ان ہی کی مجلس سے جو علماء، ادبا اور شعراء مستفید ہوکر نکلے انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ "آہ علام علی آزاد" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ (۱۲۰۰ھ)

اورنگ آباد ان دنوں علوم و فنون کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ناصر جنگ کا زمانہ پلک جھپکتے بیت گیا۔ ورنہ بقول ڈاکٹر زور[1] "آثار تو ایسے تھے کہ دکن پھر ایک بار محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ کی جھلک دیکھ لیتا۔ اورنگ آباد اس وقت ہر طرح سے عروج کمال کو پہنچ چکا تھا قدرت کو اپنا قانون پورا کرنا تھا اس نے بہت جلد زوال کے اسباب پیدا کردیئے اور ناصر جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی اورنگ آباد بھی اجڑ گیا اور وہاں کی تمام چہل پہل اور علمی و ادبی سرگرمیاں حیدر آباد میں منتقل ہوگئیں۔ ناصر جنگ اور اورنگ آباد

۱ رسالہ جامعہ، جلد ۱۲، شمارہ ۳، ۴۔

کا خاتمہ اصل میں اس قدیم طرز شعر و سخن کا خاتمہ تھا جو عہد قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کی یادگار تھا۔

ڈاکٹر زور سے جزوی اختلاف ہے کہ اورنگ آباد کا طرز سخن قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کی یادگار تھا یہ صحیح ہے کہ ناصر جنگ کی شہادت اور اورنگ آباد سے پائے تخت کی منتقلی کی وجہ سے اورنگ آباد کی محفل ماند پڑ گئی۔ لیکن شاہان آصفیہ اور اکابر و امرا نے چراغ دہلی کی روشنی میں جو روایتیں قائم کی تھیں وہ بدستور قائم رہیں بلکہ بتدریج ان کا ارتقاء جاری رہا ہے۔

ناصر جنگ کے انتقال کے بعد مظفر جنگ اور پھر نواب سید محمد خان صلابت جنگ سربراہ سلطنت ہوئے صلابت جنگ آصفجاہ اول کے تیسرے صاحبزادے ہیں اور تقریباً نو سال تک حکمراں رہے۔ ناصر جنگ نے جس چمن کی آبیاری کی تھی یہ اس کی نگہداشت کرتے رہے گو آپ کا زمانہ سازشوں اور ہنگاموں میں گذرتا رہا اس کے باوجود یہ بات اہم ہے کہ اسی زمانہ میں تذکرۂ "شعرائے اُردو" لکھا گیا خواجہ حمید خان حمید نے گلشن گفتار کے نام سے اردو شعرا کا تذکرہ لکھا اس میں دکن کے شعرا کے ساتھ ساتھ اس وقت کے شمالی ہند کے شعراء کا بھی ذکر ہے۔ اسی زمانہ میں میر نے بھی "نکات الشعراء" (۱۱۶۵ ھ) ضبط تحریر میں لایا۔ خواجہ حمید نے اپنے تذکرہ کا مادہ تاریخ یوں بیان کیا ہے۔ ؎

لکھا ہم نے جب تذکرہ کو حمید
ہوا خوش جسے فہم اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کرکے دل
کہا گلشن بزم گفتار ہے

(۱۱۶۵ ھ)

ڈاکٹر خالدہ یوسف نے اس تذکرہ کے ساتھ افضل بیگ خان قاقشال کے تذکرہ کا ذکر کیا ہے اور گلشن گفتار کی خصوصیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔[1] گلشن گفتار دکن کے ریختہ گو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ چھوٹی تحق میں شائع

۱۔ ماہنامہ سب رس، ص ۱۵، نومبر ۱۹۶۲ ع۔

ہوا ہے اور اس میں کوئی تیس (۳۰) شعرا کا ذکر شامل ہے۔ سات اورنگ آباد کے شعرا ولی، عزلت، فراقی، ابدال اور فصلی شامل ہیں اور یہ کہ تذکرہ کا اسلوب بیان نہایت سلیس اور سادہ ہے۔

قافشاں کے فارسی تذکرہ کو ۱۱۶۸ھ میں خواجہ عنایت اللہ فتوت نے مرتب کیا جس کو تذکرہ ریاض حسنی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خواجہ عنایت اللہ المتخلص بہ فتوت کے اجداد بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ فتوت کے دادا خواجہ آفتاب اورنگ آباد آئے اورنگ آباد آنے سے پہلے ان کا قیام جالندہ میں تھا۔ فتوت کے باپ خواجہ عبد الرحمن تھے جو سرکار آصفیہ کی سلک ملازمت میں داخل اور لشکر جنگ کے خطاب اور جاگیر سے ممتاز تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ لشکر جنگ کے مرنے پر ان کے دونوں لڑکوں یعنی خواجہ عنایت اللہ اور ابوالبرکات کو دربار آصفیہ سے جاگیر اور خان و بہادر کے خطاب عطا ہوئے تھے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے مزید لکھا ہے کہ خواجہ عنایت اللہ کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی تھی۔ سراج اورنگ آبادی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا۔ ریاض حسنی شعراء کا تذکرہ ہے جو نواب صلابت جنگ کے عہد حکومت میں لکھا گیا۔

صلابت جنگ کی نظر بندی کے سال شعراء کا ایک اہم تذکرہ «چمنستان شعراء» کے نام سے منظر عام پر آیا۔ لالہ لچھمی نراین شفیق کا یہ ابتدائی دور تھا اور اسی ابتدائی دور میں انہوں نے ایک اہم تصنیف پیش کی۔ شفیق کو تاریخ نویسی کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ شفیق کے والد رائے منسا رام کہنہ مشق ادیب تھے اور فارسی میں ایک کتاب «مآثر نظامی» اور دوسری «قانون دربار» کے نام سے لکھی منسا رام اپنی کتاب مآثر نظامی میں اپنا خاندانی حال لکھتے ہوئے خود کو آصف جاہی، اپنے والد کا نام بھوانی داس عارف الدین خانی اور دادا کا نام بال کشن عابد خانی بتاتے ہیں۔ جس سے اس خاندان کی قدیمی نسبت کا اظہار ہوتا ہے۔ رائے منسا رام اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اگرچہ وہ بہت کم عمری میں یتیم ہوگئے تھے لیکن سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے ایسی لیاقت حاصل کی کہ حضرت آصفجاہ اول نے صدارت صوبہ جات دکن کی خدمت پیش کاری پر مامور فرمایا۔ وہ اس سے پہلے بخشی الممالک کی پیشکاری کے

فرائض انجام دے چکے تھے۔ وہ نہ صرف دفتری خدمات کو عمدگی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ علم و ادب سے کماحقہ بہرور بھی تھے۔ خصوصاً انہیں تاریخ و انشاء کا خاص ذوق تھا۔ ان کی تصانیف مآثر نظامی اور قانون دربار آصفی بہت ہی قابل قدر تاریخی کتب ہیں۔ اول الذکر میں آصف جاہ اول کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں جو اکثر ان کے چشم دید گواہ ہیں۔ یا خود موصوف کی زبان مبارک سے سنے ہیں یا ثقہ اور معتبر لوگوں سے معلوم کئے ہوئے ہیں یہ کتاب حضرت آصف جاہ اول کی بہت ہی مستند و معتبر سوانح عمری ہے۔ دوسری کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دربار آصفیہ کے ضوابط درج ہیں۔،[1]

مولوی سید محمد نے لچھمی نارائن کے بارے میں لکھا ہے کہ ، شفیق ۱۱۵۸ع میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد شیخ عبدالقادر سے جو ایک بڑے عالم تھے۔ کتب متعارفہ کی تحصیل کی اور عربی، فارسی صرف و نحو وغیرہ، علوم مروجہ میں مہارت حاصل کی۔ ان کے خاندان میں علم و ادب کا کافی چرچا تھا۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ گیارہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے۔ شاعری اور بعض دیگر علوم میں ان کو مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ مولانا آزاد کے فیض تربیت سے ادب اور انشا میں شفیق نے بہت جلد دستگاہ حاصل کرلی۔ نیز شاعری میں چند ہی سال کے عرصہ میں دو ہزار بیت کا دیوان مرتب کرلیا۔،[2]

مولوی عبدالحق نے مقدمہ چمنستان شعراء میں شفیق کی ولادت ۱۱۸۵ھ بتایا ہے۔[3] حالانکہ آگے چل کر لکھتے ہیں ، کتاب کا نام چمنستان شعراء تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے۔[4] مولوی عبدالحق سے ایسا سہو ممکن نہیں ہے شاید یہ کتابت کی غلطی ہو یا پھر انہوں نے رو میں ۵۸ کی بجائے ۸۵ لکھ دیا ہو۔

۱، ۲ مرقع سخن، جلد دوم، ص ۷۵، ۷۶، مضمون از سید محمد۔

۳، ۴ مقدمات عبدالحق، ص ۴۲، ۵۴، مرتبہ عبادت بریلوی۔

چمنستان شعراء کی تصنیف چونکہ اورنگ آباد کے اجڑنے اور حیدر آباد کے بارہ سنے سے پہلے ہوئی اس لئے ان کی دوسری تصانیف کا ذکر میر نظام ی علی کے دور حیـــدر آباد میں آئے گا. چمنستان شعراء کو مرتب کرنے ہوئے لوی عبدالحق نے مبسوط مقدمہ لکھا ہے ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ « شفیق نے اس کرہ کی ترتیب میں عجب جدت دکھائی ہے ۔ اب تک جتنے فارسی اردو کے کرے لکھے گئے ہیں (سوائے میر صاحب کے تذکرے کے جس میں کوئی ترتیب یں) ان میں ناموں کی (یعنی تخلصوں کی) ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے ۔ کن شفیق نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنی حساب جمل کے لحاظ سے کھی ہے اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی ۔ نہ خود مولف نے اس کی وئی وجہ بتائی ہے سوا اس کے کہ خواہی کی ترنگ کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں ۔ » ؟

مقدمہ میں مولوی عبدالحق نے چمنستان شعراء کی جن دوسری خصوصیات ا ذکر کیا ہے ان میں شفیق کا انداز بیان بھی شامل ہے ۔ « شفیق کی عبارت میں نگینی پائی جاتی ہے بعض اوقات تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ہیں ، عبارت گنجلک نہیں بیان صاف اور شستہ ہے ۔ اور زبان پر قدرت ہے ۔ کہیں میر صاحب کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہے ہو اس کی طرف بھی اشارہ کردیتے ہیں جس سے شفیق کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے »

شفیق نے میر اور فتح علی کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے ۔ بقول عبدالحق بعض جگہوں پر شاہ عبـــدالحکیم ، سراج الدین خان آرزو ، مولانا آزاد بلگرامی ، حاجی علی اکبر اور رضا خان انوار کی بیاضوں کے حوالے بھی ملتے ہیں ۔ شفیق کا تذکرہ میر اور فتح علی گردیزی کے تذکروں سے بڑا ہے اور بہت سے ایسے شعراء کا تذکرہ درج ہے جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا

شفیق ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا البتہ میر صاحب کے خلاف خوب زہر اگلا ہے اور خوب میر صاحب کے ذکر میں بھی ان کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے ۔ شفیق یقین کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اس کی تقلید کو باعث فخر سمجھتا ہے

چمنستان شعراء کا اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعہ سے واقشال کے تذکرہ تحفۃ الشعراء (۱۱۶۵ ھ) کا پتہ بھی چلتا ہے، شفیق کے چمنستان شعراء کو کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ تحفۃ الشعراء کے مطالعہ سے مستغنی کردیتا ہے۔

شفیق نے جس زمانہ میں تذکرہ لکھا (۱۱۷۵ ھ) اس وقت اورنگ آباد کے تذکروں کے علاوہ شمالی ہند میں تذکرہ نویسی کا کام جاری تھا۔ چنانچہ فائز، ابرو، شاہ حاتم، سودا، میر اور گردیزی کے تذکرے ضبط تحریر میں آچکے تھے۔ بعد بھی قائم، میر حسن اور مصحفی کے تذکرے منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے میر اور شفیق کا موازنہ کیا ہے اور کہا کہ میر دکنی شعراء کا ذکر نہیں کرتے یا انہیں اہمیت نہیں دیتے برخلاف اس کے شفیق نے وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔

مولوی سید محمد نے شفیق کی تاریخ وفات کے تعلق سے مولف «دکن میں اردو» کے حوالے سے لکھا ہے کہ «غالباً ۱۲۱۵ ھ کے بعد شفیق کا انتقال ہوا۔»[1]

جس طرح قیام سلطنت آصفیہ کے بعد شعر و ادب کی سرپرستی آصف جاہ اول، مظفر جنگ اور ناصر جنگ نے کی تھی اسی طرح صلابت جنگ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ صلابت جنگ نے صرف تین یا چار سال بمشکل تمام حکومت کی لیکن اس مختصر ترین زمانہ میں بھی علم و ادب کے گلشن کی دلچسپی اور انہماک سے آب یاری کی، وہ امور مملکت میں کمزور رہے ہوں لیکن معاملات تہذیب میں ناصر جنگ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ چنانچہ انتہائی کم مدت میں فارسی تذکروں کی قابل قدر تصانیف و تالیف کا کام ہوا۔ یہ ان کی ادب نوازی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے درگاہ قلی خان سالار جنگ کو منصب شش ہزاری اور موتمن الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ سید عبدالولی عزلت کو جو بلند پایہ شاعر، صاحب کمال ادیب اور بہترین مصور اور موسیقی کے استاد مانے جاتے تھے ایک جاگیر انعام دی۔ اس طرح نور محمد عاصی کو بھی منصب سے سرفراز کیا۔[2]

• • •

---

۱ مرقع سخن، جلد دوم، سید محمد، ص ۷٦۔

۲ عہد عثمانی میں اردو خدمات مولفہ احمد آصفجاہی، ص ۱۲۔

اردو شاعری میں تلمیح کا استعمال

از
پروفیسر سید شاہ عقیل، شیموگہ (کرناٹک)

تلمیحات کے استعمال سے شاعری میں ترسیل، معنی آفرینی، اثر و دلگدازی جیسی خوبیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ درحقیقت تلمیحات دلنواز تاریخی واقعات بھی ہیں اور روح فرسا حقائق بھی۔ نفس طبع کے لیے عشقیہ داستانیں بھی ہیں اور تہذیبی و سماجی حکایات کی جلوہ آفرینی بھی۔ ان کے ذریعے قاری اپنے آباو اجداد کے شاندار ماضی اور قوم و ملت کے درخشندہ کارناموں سے واقف ہوجاتا ہے۔ غرض تلمیحات ادب کا ایک ایسا گلدستہ ہیں جس میں رنگ برنگے پھول اور طرح طرح کی خوشبوئیں یک جا ہوگئی ہیں۔ تلمیحات میں موجود اس تنوع اور وسعت کی وجہ سے ادب میں انہیں جو اہمیت حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور صنعت کو نصیب ہوئی ہو۔

تلمیح کی افادیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب قاری کسی شعر میں ایک معمولی سا اشارہ بھی پاتا ہے تو فوراً اس کا خیال ایک طویل ترین واقعے کے پس منظر میں پہنچ کر اس سے متعلق یادوں کو تازہ کرلیتا ہے اور اس واقعے کے دردانگیز یا فرحت بخش اثرات کو شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے۔ تلمیحات قاری کا رشتہ ماضی سے مربوط و مضبوط کرتی ہیں۔ یہ پرانی یادوں کو تازہ کرنے کا ذریعہ ہیں اور انہیں تازگی بخشتی ہیں ان کے ذریعہ انسان اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو یاد کرتا ہے اور اپنا محاسبہ کرکے راہِ عمل اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے ان کے مطالعے سے وہ اپنے منصوبوں کی ناکامیوں کو برداشت کرنے اور اپنی کامیابیوں سے محظوظ ہونے کی قوت و صلاحیت پیدا کرلیتا ہے۔

تلمیحات میں موجود انہی افادی عناصر کے مدِ نظر ایک شاعر اپنے کلام کو تلمیحات سے آراستہ کرتا ہے یہ سلسلہ جو دکنی زبان سے شروع ہوا تھا آج بھی برابر جاری ہے۔

تلمیحات کے استعمال سے ہر صنف شاعری کو ایک خاص حسن عطا ہوا ہے اس کے استعمال سے مثنوی اور منظوم داستانوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے اور

مرثیہ، قصیدہ، حمد و نعت، طویل نظمیں، مختصر نظمیں، غزل۔ حتیٰ کہ شاعری کی مختصر ترین صنف قطعہ و رباعی کو بھی اس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے شعر میں فصاحت و بلاغت بھی پیدا ہوتی ہے اور یہ ترسیل میں معاون و مددگار بھی ثابت ہوتی ہے۔

شاعری میں تلمیح کی اہمیت و افادیت کا جائزہ لینے کے لیے حسب ذیل خصوصیات پر تفصیل سے بحث کرنا لازمی ہے۔

۱۔ ایجاز و اختصار،

۲۔ تلمیحات — تاریخی جزئیات کے محافظ،

۳۔ تلمیحات — ماضی کی نشانیاں اور مستقبل کی جھلکیاں،

۴۔ تلمیحات — میں محاکاتی عناصر،

۵۔ تلمیحات — اصلاح قوم و معاشرہ کا ذریعہ، اور

۶۔ تلمیحات — شاعر کی شخصیت اور علمیت کا مظہر۔

ایجاز و اختصار:

منظوم داستانوں اور مثنویوں کے علاوہ اردو شاعری میں جتنے اصنافِ سخن رائج ہیں، سب کے سب ایجاز و اختصار کے متقاضی ہیں۔ نظم کا کینواس نثر کی بہ نسبت محدود ہوتا ہے اور اس میں واقعات کے تفصیلی اظہار کے لیے جگہ ناکافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا تلمیحات کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے ذریعہ واقعات کے مکمل اظہار کی زحمت سے نجات حاصل کرلی کیونکہ صرف ایک تلمیحی اشارہ واقعے کے مکمل اظہار کا فرض ادا کرتا ہے تلمیح کی یہی جامعیت ہے جو اس کو ایجاز و اختصار کی منزلوں تک پہنچاتی ہے۔

ایجاز و اختصار کا مفہوم یہی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی و مفہوم ادا ہوجائیں۔ تلمیح کی اس خصوصیت کی تصدیق کے سلسلہ میں حسب ذیل اقتباسات معاون ثابت ہوسکتے ہیں:

"بلاغت کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنی سمجھے جائیں۔ یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہے، الفاظ کے دیگر اقسام میں نہیں پائی جاتی۔ جس زبان میں تلمیحات کم ہیں وہ بلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے۔ ایسی زبانوں میں بولنے والوں، لکھنے والوں اور شعر کہنے والوں کو اپنے مطالب کے ادا کرنے میں بہت زیادہ وقت صائع کرنا پڑتا ہے۔ سننے والے ایک ہی واقعے کو بار بار سننے سے اکتا جاتے ہیں۔ اگر واقعہ ایک مختصر لفظ سے تعبیر کیا جائے تو اس کا دہرانا اجیرن نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔"[1]

تلمیح کے اس ایجاز و اختصار کے پہلو کو محمود نیازی نے یوں ظاہر کیا ہے۔

"تلمیح کو استعمال کرنے کا اصل مقصد کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب کی ادائیگی ہے۔ اگر ہر بات کو تفصیل سے کہا جائے اور طول طویل کہانیاں اور قصوں کو بار بار دہرایا جائے تو سننے والے بھی اکتا جاتے ہیں اور کہنے والے کا بھی وقت صائع ہوتا ہے اسی بات کو اگر اشاروں میں بیان کردیا جائے تو گفتگو میں فصاحت اور بلاغت پیدا ہوجاتی ہے اور سامع کو بھی اک نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ تلمیحی الفاظ، گو مختصر ہوتے لیکن اپنے اندر وسیع مطالب پنہاں رکھتے۔"[2]

شاعری میں تلمیحات کے استعمال کا سب سے زیادہ افادی پہلو ایجاز و اختصار ہی ہے۔ اس کا اظہار مصاحب علی صدیقی کے حسب ذیل اقتباس سے خوب واضح ہوگا۔ کہتے ہیں:

"تلمیح کی ابتدا، اس کی ارتقائی منزل اس حقیقت کی شاہد ہے کہ

---

۱ افادات سلیم از وحیدالدین سلیم، پانی پتی، نئی دہلی، ۱۹۷۲ ع، ص ۹۳۔
۲ تلمیحات غالب از محمود نیازی، نئی دہلی، ۱۹۷۲ ع، ص ۱۰۔

تلمیح دراصل ایک فطری تقاضا ہے۔ وہ سماج کی ضرورت کا ایک سرچشمہ ہے، وہ تمدن کا سنگِ میل ہے، وہ ایجاز و اختصار کی اہم کڑی ہے، وہ حسنِ کلام کا مرقع ہے، وہ عروج کمال کی کسوٹی ہے جو نہ صرف ایک قدیم صنعت ہے بلکہ دیگر صنائع کے مقابلے میں یہ صنعت نہایت دلچسپ، لطیف اور جامع ہے۔ [1]

اسی خیال کو موصوف نے ایک اور مقام پر یوں بیان کیا ہے:

تلمیح قادر الکلامی کا موثر پیرایہ بیان ہے جس سے ادق سے ادق مضمون کو بحسن و خوبی ادا کر سکتے ہیں اور جس میں اختصار اعجاز کی حد تک پہنچ سکتا ہے۔ [2]

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ ایجاز و اختصار تلمیح کی اہم ترین خصوصیت ہے اور اس کی مقبولیت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ شاعری میں اس کے استعمال کا سب سے بڑا افادی پہلو یہی ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر شاعروں نے اس صنف کو کثرت سے برتا ہے اور اپنے کلام کو اس کے حسن سے آراستہ کیا ہے۔ بالخصوص غزل گو شعرا نے تلمیح کی اس خصوصیت سے اچھا خاصا استفادہ کیا ہے۔ شاعری میں جتنی تلمیحات کا استعمال ہوا ہے وہ تمام تلمیحات اور اس سے متعلق اشعار ایجاز و اختصار کی مثالوں کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

شاعروں کو جب بھی اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے طویل بحث درکار ہوگی تو انھوں نے اُس مقام پر تلمیح سے کام لیا، اس طرح اپنے اظہارِ خیال میں کامیابی حاصل کرلی مثال کے طور پر اگر کوئی شاعر اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ اس کے اطراف ناکامیوں اور ناامیدیوں کے ساتھ حوصلہ شکن حالات کی حکمرانی ہے اور وہ ایسے ماحول سے پریشان حال

---

۱ اردو ادب میں تلمیحات از: مصاحب علی صدیقی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ ع، ص ۱۰۔

۲ ایضاً - - - - - - ص ۸۰۔

ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اظہار خیال کے لیے غزل کے شعر کا دائرہ ناکافی محسوس ہوگا. ان حالات میں ایک مناسب تلمیح کا استعمال اس کے خیالات کو مکمل و موثر طور پر پیش کرنے میں معاون و مددگار ہوگا اور قاری بھی ایسے خیالات سے لطف اندوز ہونے بغیر نہیں رہے گا. مثلاً ؎

اس سیاہی میں کیا سحر ہو نمود
گھر گیا دودِ آتشِ نمرود
(داغ دہلوی)

اس شعر میں آتشِ نمرود کے استعمال سے شاعر کے خیال کا مکمل اظہار بھی ہوا اور واقعہ ابراہیم خلیل اللہ کی طرف ایجاز و اختصار کے ساتھ اشارہ بھی.

اردو شاعری میں کئی پیغمبروں کی زندگیوں کے سلسلے میں تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ تفصیل کے بجائے اشاروں سے کام لیا گیا ہے اور یہ اشارے مکمل واقعے کے مترادف ہیں مثال کے طور پر ؎

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
(علامہ اقبال)

حضرت عیسیٰ کو ان کی قوم نے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں. بالآخر سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کو صلیب پر لٹکا دیا جائے. کہا جاتا ہے کہ اس شب اللہ تعالیٰ نے انھیں زمین سے اٹھا لیا اور چوتھے آسمان پر پہنچا دیا تاکہ اللہ کے پیارے بندے کی حفاظت ہوجائے ان کی جگہ ایک دوسرے شخص کو جو ان کا ہم شکل تھا، ان کی قوم نے صلیب پر لٹکا دیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ عیسیٰ صلیب پر لٹکا دئے گئے اس طویل واقعے کو مندرجہ بالا شعر میں بالکل اختصار کے ساتھ پیش کردیا گیا ہے. کمال یہ ہے کہ حسنِ شعر میں فرق آنے کے بجائے اضافہ ہوگیا ہے.

ایجاز و اختصار کی ایک اور مثال کے طور پر مومن کا حسبِ ذیل شعر

قابلِ غور ہے ؎

ہم بھی تو نادان ہیں آخر پاس مطلب کے لئے
خضر موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا
(مومن خاں مومن)

خضر اور موسیٰ کی ملاقات، کشتی کا تختہ توڑنا، گرتی ہوئی دیوار کو بلا معاوضہ از سرِ نو تعمیر کرنا اور ایک کمسن بچے کا قتل کرنا، ان حرکات پر موسیٰ کی باز پرس اور خضر سے تسلی بخش جوابوں کا ملنا وغیرہ ایک طویل واقعہ ہے لیکن تلمیح کے استعمال کا کمال دیکھئے کہ صرف ایک شعر میں اس کا یوں اظہار ہوا ہے کہ کیا کہئے !

یہ مثالیں اس بات کا مدلل ثبوت ہیں کہ تلمیح ایجاز و اختصار کی بہترین مثال ہوا کرتی ہے۔ ذیل میں چند اشعار منقول ہیں جو اختصار کی کامیاب مثالیں بھی ہیں اور تلمیحات سے مزین بھی ؎

علی کے بازوئے خیبر شکن کی مجھ کو قسم
کہ ناز مجھ کو بھی ہے اپنی بو ترابی پر
(ظفر علی خاں)

دل راہ چلتے چھین لیا مجھ سے یار نے
یوسف کا فیصلہ سرِ بازار ہوگیا
(امیر مینائی)

خطاب اس دن سے اسماعیل نے پایا ذبیح اللہ
خدا نے آپ ان کے حق میں فرمایا ذبیح اللہ
(حفیظ جالندھری)

ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرم نوا
حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضاء دیکھیں
(اصغر گونڈوی)

اس نے حیرت سے کہا دیکھی جو لیلیٰ کی شبیہ
قیس دیوانہ ہوا تھا اس بلا کو دیکھ کر
(داغ دہلوی)

تلمیحات - تاریخی جزئیات کی محافظ :

ہر ملک میں بے شمار سیاسی و سماجی تحریکیں جنم لیتی ہیں اور ختم ہوجاتی ہیں، سلطنتوں کے تختے الٹ جاتے ہیں، شہر و بستیاں تباہ و برباد ہوجاتی ہیں اور نامور شخصیتیں گمنامی کے غار میں گم ہوجاتی ہیں مورخین ان تمام حالات کا مکمل احاطہ تاریخوں میں نہیں کرپاتے۔ کبھی خوف ان کا قلم روک لیتا ہے تو کبھی مصلحت ان کا دامن تھام لیتی ہے۔ شاعر ان تمام مصلحتوں اور خوف و ہراس سے مبرّا ہوتا ہے اسی لیے شاعر کو سماج کا ناض کہا گیا ہے۔ شاعر تلمیحات کے ذریعے سے تاریخی جزئیات کو اپنے کلام میں محفوظ کرلیتا ہے جبکہ تاریخی کتابوں میں واقعات سے متعلق صرف وجوہات اور نتائج کا ذکر ملتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ ہو یا سیاسی تحریک یک لخت رونما نہیں ہوسکتے بلکہ ان کے تناظر میں کئی چھوٹے بڑے حقائق کارفرما ہوتے ہیں ہر تاریخ ساز واقعے سے وابستہ ایسے کئی واقعات ہوتے ہیں جنہیں غیر ضروری سمجھ کر اس دور کے مورخ نظر انداز کردیتے ہیں جبکہ ہر تحریک، یا واقعہ انہی جزئیات کا تدریجی نتیجہ ہوتا ہے۔ تلمیحات ایسے واقعات کی جزئیات کو اپنے دامن میں سمیٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مورخ شاعری سے تاریخی حقائق اخذ کرنا چاہے تو اسے بے شمار شعرا کے کلام میں ایسی سیکڑوں تلمیحیں دستیاب ہونگی جو تشکیلِ تاریخ میں مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی ہیں۔

تلمیحات کے ذریعہ ادب کو حاصل ہونے والا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب ہم تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کی غرض سے تلمیحات پر نظر ڈالیں گے تو کسی بھی تحریک یا شخصیت کے تعلق سے ایسے بے شمار جزئیات مل جائیں گی جن کا تواریخ میں شاید ہی کہیں ذکر ہوا ہو۔ مثال کے طور پر ہم (غدرِ دلی) کا

اثرہ لے سکتے ہیں ۱۸۵۷ ع کا غدر ملک کی ایک عظیم ترین سیاسی تحریک تھی۔ اس کے نتیجے میں چار سو سالہ مغلیہ حکومت کا قلع قمع ہوگیا اور سارے ملک پر انگریز قابض ہوگئے۔ اس تاریخی تحریک کا ذکر بہادر شاہ ظفر کی شکست اور انگریزوں کی فتح کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن شاعری میں مستعمل تلمیحات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تحریک سے متعلق کئی جزئیات ہمارے سامنے ابھر آتی ہیں، مثال کے طور پر ؎

داغ فـــراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
(مرزا غالب)

اس شعر میں بہادر شاہ ظفر کی اس مجبور اور بے بس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے جب وہ تختِ مغلیہ پر جلوہ افروز تھے، برائے نام انہیں شہنشاہ کہا جاتا تھا۔ جبکہ ان کی حکومت صرف لال قلعہ تک محـــدود تھی۔ بہادر شاہ ظفر اس قدر بے دست و پا تھے کہ ان کو قلعے سے باہر نکلنے کے لیے بھی انگریزوں سے اجازت لینا پڑتی تھی غــالب نے انھیں ایک ایسی شمع سے تشبیہ دی ہے جو تقریباً خمـــوش ہے۔ اس طرح انھوں نے بہادر شاہ ظفـــر کی کس مپرسی کی تصویر کشی کی ہے۔

۱۸۵۷ ع میں جب غدر برپا ہوا تو بہادر شاہ ظفر چاروں طرف سے انگریزوں کی زد میں آگئے۔ ان حالات میں انھیں قلعہ چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہذا وہ قلعے سے نکلے اور مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہوگئے۔ شومئ قسمت دیکھئے کہ انگریزوں کو اس بات کی خبر ہوگئی اور وہ وہاں سے گرفتار کرلیے گئے اور سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل کردیا گیا اس واقعے کو ذیل کے اشعار میں بطور تلمیح پیش کیا ہے ؎

اس ترے گنبد کے پیچھے اے جہاں اضطراب — ایسی دو قبریں ہیں جن کا ہے نہیں کوئی جواب
ایک مزارِ کج کلاہ، اک کج کلاہی کا مزار — شاہ کی تربت کے پہلو میں ہے شاہی کا مزار
(جوش ملیح آبادی)

بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرنے کے بعد چند دنوں تک دلی میں قید رکھا گیا. اس وقت انہوں نے انگریزوں سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے بچوں کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں تو اس وقت ظالم انگریزوں نے ظلم کی انتہا کردی۔ اس طرح کہ، اُن کے دونوں شہزادوں کو قتل کرکے ان کے سر ایک تھال میں رکھ کر مظلوم بادشاہ کے سامنے پیش کردئے گئے، جب انہوں نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا تو جواب ملا کہ تم نے صرف اپنے بچوں کی صورت دیکھنی چاہی۔ لہٰذا ان کی صورت دکھانے کی یہ ایک ہی صورت تھی۔ اس اندوہناک واقعے کی تلمیح حسبِ ذیل شعر میں موجود ہے ؎

تیسرے فاقے سے اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے
(نا معلوم)

بہادر شاہ ظفر کی آخری خواہش یہ تھی کہ انہیں مرنے کے بعد اپنے وطن دلی میں دفن کیا جائے۔ انہوں نے انگریز حاکموں سے اس کی گذارش بھی کی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی گزارش مسترد کردی جائے گی۔ آخر کو وہی ہوا جو ہونا تھا۔ انہیں بقیدِ حیات دکھی رنگوں سے نکلنے کا موقع ملا اور نا ہی بعدِ وفات۔ ظفر نے اپنی مایوس اور حسرت بھری خواہش کو بطور تلمیح ذیل کے شعر میں باندھا ہے ؎

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں
(بہادر شاہ ظفر)

بہادر شاہ ظفر کی شکست اور غدر دلی ایک تاریخی حقیقت ہے اور مندرجہ بالا تمام تلمیحات اس اہم واقعے کی جزئیات ہیں جن کو شعرا نے تلمیحات کے ذریعہ شاعری میں محفوظ کردیا ہے۔

اسی انداز سے اگر معرکۂ کربلا کی جزئیات پر غور کریں تو ہمارے سامنے

بے شمار واقعات آتے ہیں جنھوں نے تلمیحات کا روپ دھار لیا ہے جیسے مسلم بن عقیل کی شہادت، کوفیوں کی طوطا چشمی، حُر کا اہل بیت کی طرف سے شہید ہونا، حضرت زینب کی قربانیاں، یزید کے دربار میں ان کی گفتگو، حضرت عباس کی شہادت، علی اصغر کی شہادت، شمر کا رویہ، حضرت زین العابدین کی بے بسی، پیاس کی شدت، حضرت قاسم کی شادی اور ان کی شہادت وغیرہ ان ساری جزئیات کو شاعروں کے کلام میں تلمیحات کی شکل میں بحسن و خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

درج ذیل اشعار میں مستعمل تلمیحات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تلمیحات تاریخی جزئیات کی محافظ ہیں ؎

کریں ہم دغا آپ سے توبہ توبہ
یہ کوفی کریں گے یہ شامی کریں گے
(داغ دہلوی)

یدِ بیضا کے ساتھ اس حلقۂ ظلمت میں در آئے
یہودی قوم کو آزاد کر کے مصر سے لائے
(حفیظ جالندھری)

ربیلہ کس قدر ظالم، جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے
(علامہ اقبال)

بچائے حق تعالیٰ اس یزیدی شمر مشرب سے
کہ جوں سید کا حس بے رحم کو خونِ کبوتر تھا
(ذوق دہلوی)

یہاں پستا نہ بھولے گی وفاداری کے وعدوں کو
یہاں قرباں کر سکتی ہیں مائیں اپنے بیٹوں کو
(نثار پرویز)

وادیٔ ایمن میں تھی برق تجلی بے حجاب
حیرت موسیٰ تھی پردہ جلوہ گاہِ طور پر
(امیر مینائی)

تلمیحات۔ ماضی کی شعاعیں اور مستقبل کی جھلکیاں۔

بانیٔ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)، سر سید احمد خان نے اپنے مضمون "اپنی مدد آپ"، میں لکھا ہے کہ

"ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجے تک پہنچایا ہے ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی، ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے رفتہ رفتہ زمانے کی گردش نے موجودہ نسل کو اس ذخیرہ اور بے بہا خانداد کا وارث کیا جو ہمارے بزرگوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہے کہ موجودہ نسل کی تہذیب، اخلاق، سائنس اور ٹکنالوجی، سماجی زندگی اور علم و ہنر کی بنیادیں ماضی سے پیوست ہیں۔ جس قوم کا ماضی جتنا محقق اور شاندار رہا ہے اس قوم کا حال بھی اتنا ہی درخشاں رہے گا بشرطیکہ وہ اپنے ماضی کو فراموش نہ کرے۔ ورنہ ماضی اور حال کا تعلق ٹوٹ جائے گا جو قوم جدیدیت کے نام پر ماضی سے منقطع اور نالاں ہے وہ ایک دن افراتفری کا شکار ہوجائے گی۔

موجودہ نسلیں اپنے ماضی سے جس قدر گہرا تعلق رکھیں گی ان کے اندر اسی قدر تیقن، خود اعتمادی، تجربہ اور ٹھہراؤ پیدا ہوگا۔ موجودہ دور میں انسان اس قدر تیز رفتاری اور مصروفیت کا شکار ہوگیا ہے کہ اس کے پاس ماضی یا اپنے بزرگوں کے تعلق سے مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ ان حالات میں شاعری میں استعمال ہونے والی تلمیحات ہمارے لیے ایک بے بہا خزانہ

1 تہذیب الاخلاق، مرتبہ، ملک فضل الدین، لاہور ۱۹۱۱ع، ص ۱۳۱، جلد دوم۔

کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ شعر میں آنے والا ایک ایک تلمیحی اشارہ ہمیں ماضی کی طویل داستانوں سے روشناس کراتا ہے اور ہمارے ذہن میں ماضی کی نشانیاں اس قدر تازہ کرتا ہے کہ قاری ان واقعات کو شاید ہی بھلا سکے۔

تلمیحات ماضی کی وہ کامیاب نشانیاں ہوتی ہیں کہ جن کی مدد سے انسان اپنے حال کا رشتہ اپنے ماضی سے بآسانی جوڑ سکتا ہے۔ جو قوم اپنے ماضی کو بھلا دیتی ہے اس کا حال بے بنیاد اور مستقبل تاریک ہوجاتا ہے اس لیے کہ ماضی کا رشتہ قوموں کو صحیح راہ متعین کرنے میں مدد دیتا ہے اور مشعل راہ کا کام کرتا ہے تلمیحات ماضی کو یاد رکھنے کا کامیاب ذریعہ ہیں، طویل واقعات کو بار بار دہرانے کے بجائے ایک تلمیحی لفظ یا اشارے کے استعمال سے ماضی کا مکمل واقعہ قاری کے ذہن میں ابھر آتا ہے

تلمیحات ماضی سے متعلق سیاسی، مذہبی، تاریخی، سماجی اور تہذیبی واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ صرف ایک تلمیح پر نظر ڈالنے سے ماضی کا پورا تاریک باب روشن ہوکر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بقول رام آسرا راز۔

"تلمیحیں ماضی کی وہ یادگار روایتیں ہیں جس کے مطالب ہمارے سماجی وجود میں رس بس کر دیگر لفظوں اور اصطلاحوں کی طرح زبان کا ضروری جزو بن جاتے ہیں۔ یہ تلمیحیں چونکہ عام طور پر مذہبی اور تاریخی واقعوں، لوک کتھاؤں، کلاسیکی شعرا کی طویل نظموں سے ماخوذ ہوتی ہیں اس لئے ان کی حیثیت رمز و کنایہ کی سی ہوتی ہے۔ ان کی مدد سے ان سے منسوب ایک پورا واقعہ یا کوئی مخصوص منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو اس زمانے کے بولنے والوں کے رسم و رواج یا عقیدوں پر روشنی ڈالتا ہے۔"[1]

یہ وصف سرشستِ انسانی میں پنہاں ہے کہ انسان جس بات کا ذکر بار بار

---

۱ اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ، از ڈاکٹر رام آسرا راز، دہلی ۱۹۷۵ ع، ص ۲۱۹

بہ کرے وہ بات رفتہ رفتہ اس کے دماغ سے اتر جاتی ہے یا محو ہوجاتی ہے۔ تلمیحات انسان کو اس کمزوری کا شکار ہونے سے بچا لیتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے الفاظ یا اشاروں کی مدد سے واقعات کو بار بار دہرانے پھر ان کو یاد رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اردو شاعری میں استعمال ہونے والی تقریباً تمام تلمیحات کا تعلق ماضی بعید سے ہے مثلاً ـــــ

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
(درج برائن چکبست)

اس شعر میں موجود دونوں تلمیحات (گوتم اور سرمد) کا تعلق ہمارے ماضی سے ہے۔ گوتم، بدھ مذہب کے بانی کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں ان کی تعلیمات کے ذریعے اصلاح قوم و معاشرہ کا بہت بڑا کام ہوا ہے۔ اُن کی وجہ سے اس ملک میں حسن سلوک، اہنسا اور اخلاق کی تعلیم عام ہوئی۔ اور حضرت سرمد شہید کا جو ذکر ہوا ہے ان سے یہ بات منسوب ہے کہ اُن کا وطن کاشان تھا جو ایران میں ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ سندھ سے گزر رہے تھے کہ ایک مشہور شہر ٹھٹھہ میں پہنچے اور وہاں ایک لڑکے کی شخصیت سے متاثر ہوکر مسلمان ہوئے۔ اکتسابِ علم دین کے شوق میں عہدِ عالمگیر میں ہندوستان آئے اور یہیں کے ہورہے۔ اُن کو اس ملک سے ایسا عشق ہوا کہ اپنا ملک بھول گئے، اور اسی سرزمین میں پیوندِ خاک ہوگئے۔ یہ دونوں تلمیحات ہمارے ملک کے ماضی کی کامیاب نشانیاں ہیں۔

• • •

کتابی دُنیا

ملک محمد جائسی کی 'پدماوت'

(مرتبہ منظور الحسن مسطور)

تبصرہ از

جناب محمد بدیع الزماں، پھلواری شریف، پٹنہ

جناب منظور الحسن مسطور کی تالیف 'ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' جدید تحقیقات کی روشنی میں' کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہی منظور کی اردو زبان و ادب، بالخصوص شاعری کے گہرے مطالعے اور اُن پر مکمل شعور کا ہی صرف قائل ہونا نہیں پڑتا ہے بلکہ دینِ اسلام اور تصوف کے عمیق مطالعہ کا بھی پتہ ملتا ہے۔ منظور الحسن مسطور بنیادی طور پر شاعر بھی اور حیثیت شاعر ان کا مضمون 'پیغمبرِ اسلام اور صنفِ شاعری' مصنف کے ذہنی اور فکری میلانِ طبع کا غماز ہے۔

ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' پر اردو زبان میں اب تک جو کتابیں تصنیف کی گئیں یا جو مقالے منظرِ عام پر آتے رہے اُن میں منظور الحسن کی اس جدید تحقیق کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ کیونکہ اب تک نہ تو اس نقطۂ نگاہ سے تحقیق کی گئی جس نقطۂ نگاہ سے انہوں نے جائزہ لیا ہے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے باضابطہ طور پر اس ملک میں اقتدار سنبھال لینے کے بعد ملک کے مورخوں کے ایک طبقہ نے تو ہندوستان کی حالیہ صدیوں کی تاریخ مسخ کرنے

کا وطیرہ سا ہی رکھا تھا۔ مگر ہندی ادیبوں کے ایک تنگ نظر طبقہ نے معاصرت کے اس زہر کو ادب تک میں لادیا جس کا شکار جائسی اور اُن کی تصنیف (پدماوت) ہوئی۔ منظور الحسن صاحب نے بڑے حسن و خوبی سے ہندی والوں کی اس ساری شازش کو اس کتاب میں بے نقاب کیا ہے مگر ساتھ ساتھ اُن ہندی ادیبوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے تعصب سے اوپر اٹھ کر جائسی کو ادب میں جائز مقام دیا جن میں رام چندر شکل کا نام سر فہرست ہے کیونکہ انہوں نے بقول منظور الحسن :

(سالہا سال کی تحقیقات کے بڑے سنگلاخ میدانوں کو عبور کرکے دھول مٹی میں اٹے ہوئے کوہ نور کو آخر تلاش کر ہی لیا۔)

رام چندر شکل کی ۱۹۳۰ ع میں اس تحقیق کے بعد جائسی اور اُن کی (پدماوت) کے معاملہ میں ہندی والوں کا ذہن یکسر بدل گیا اور صورتِ حال یہ ہوئی کہ،

(اب پدماوت میں خامیاں گنوانے والوں سے کہیں زیادہ ایسے حقیقت پسند اہل ادب اور نقاداں، محققین موجود تھے جنہوں نے جائسی اور پدماوت پر ہزاروں کتابیں اور ڈاکٹریٹ کے لئے اپنے سینکڑوں مقالے لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے)

رام چندر شکل کی اس تحقیق کے نتیجہ کے طور پر منظور الحسن کا تجزیہ ہے کہ :

(الغرض اس طرح جائسی اور اس کے گرد پیدا کی ہوئی مصنوعی عصریت اور تعصب کی زہر آلود فضا ہموار ہوتی چلی گئی اور پدماوت کے بہت سے ایسے ادبی اور تہذیبی پہلو بھی موضوع بحث بنے جو حقیقت میں جدید تحقیقات کی دین ہے۔

منظور الحسن نے (پدماوت) کے مختلف پہلوؤں کا الگ الگ جائزہ لیا ہے جب وہ پدمنی کے حسن و جمال پر کہے گئے اشعار کو گرفت میں لاتے ہیں تو

اظہارِ خیال کرتے ہیں :

> "جو بات جانسی کی حسن نگاری میں ہے وہ کچھ اور ہی ہے اور یہ بات شاید جانسی کے صوفیانہ مسلک کے مطابق عشقِ مجازی سے عشق حقیقی کی سمت لے جانے والا ملکوتی اور فردوسی جذبہ رہا ہو۔ رعنائی و جمال میں ڈوبے ہوئے اس کے وجد آفریں اشعار کی سرمستیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر مصور رنگوں کے حسین امتزاج سے صفحۂ قرطاس پر اور سنگ تراش مرمریں مجسمہ میں ان تمام سرمستیوں کو مجتمع کرنا چاہتے تو یقیناً مصور کا موقلم اور سنگ تراش کا نازک ہتھوڑا بھی تخلیقِ حسن کے ہر موڑ پر بادۂ جمال سے سرشار ہوکر رک جانے کا"

ابھی حسن نگاری کے اس عمل میں جانسی پر ملکوتی اور فردوسی جذبوں کے غالب ہوجانے کی وجہ مظہر الحسن یہ بتاتے ہوتے کہ :

> "معلوم ہوتا ہے کہ جانسی یہ یہ تمام اشعار ایک ایسی لطیف خود فراموشی اور عالم بیخودی میں لکھتے ہیں کہ جب اس کے تصور میں اس کے صوفیانہ عقیدے کے مطابق اس کا معشوق مجازی نہیں بلکہ عالم مادی سے سے پرے خود حسن ازل رہا ہو"۔

تو خود اُن پر بے خود فراموشی طاری ہوجاتی ہے اور لطیف جذبات میں کھو کر خود اُن کے یہ اشعار اُن کی زباں پر آجاتے ہیں ؎

آستانہ ناز پر حسن کی جبیں ہے سجدہ ریز	اس کو کوئی تاج سلطانی بھی پہنائے تو کیا
دامنِ حسن ازل ہے حسن کے ہاتھوں میں مدام	اس کے قصے میں جدائی بھی چلی آئے تو کیا
یہ بہارِ عشق ایسا یہ بہار حسنِ یار	ہم کو اس عالم میں کوئی دار پہ لائے تو کیا

مظہر الحسن نے ہندی کے متعصب ادیبوں کے ذریعے جانسی اس خیالی عشقیہ داستانوں کو ہندوستان کی تاریخ کا حصہ بنا دئے جانے کی تردید، دلائل کے ساتھ کی ہے اور جانسی کے حسن میں حقیقت اور مقصدیت کا رنگ اس عشقیہ داستان

میں جائسی کی حب الوطنی، بہادری، صبر و ضبط، ناانصافی، ظلم، صداقت، خدمتِ خلق، فضیلتِ علم و عمل، خدا پرستی، عورت کا مکر و فریب، مرد کی بے وفائی جیسے موضوعات میں تلاش کی ہے دوسرے منظور الحسن نے رتن سین، ناگمتی، پدمنی، راگھو چیتن، طوطا ہیرا من اور بادشاہ علاؤ الدین جو اس منظوم داستان کے اہم کردار ہیں کے حالات و کیفیات کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کیا ہے اور اُنھیں صحیح روپ میں پیش کیا ہے

پدماوت کے ایک مضمون میں منظور صاحب نے جائسی کے فن اور حیات پر روشنی ڈالی ہے اور اُس عہد کا تاریخی، تمدنی اور مذہبی پس منظر کو بڑے حسن و خوبی سے پیش کرکے جائسی کی خدا پرستی، صوفی منشی، عاجزی اور انکساری کو بڑے موثر انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

"اگر جائسی کی عشقیہ داستان (پدمات) کا بغور تحقیقی مطالعہ کریں تو ایک بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے بظاہر یوں تو اس کا موضوع محض عشق و محبت ہے لیکن اشاروں اور کنایوں کے دبیز مگر حسین و جمیل پردوں میں اپنی ہوتی خاص بات ہے وہ ہے عشق مجازی سے عشقِ حقیقی کی جانب اس کے شاعرانہ تصوف کا روحانی سفر ویسے عموعی طور پر جائسی کے شاعرانہ تصوف کا تعلق اس باتِ باری کے ساتھ ایک گہرے وجدانی اور شاعرانہ جذبۂ بے خودی میں منسلک ہے لیکن اس کا یہ جذبہ اتنا وسیع و عمیق ہے کہ شاعر دنیا کے ہنگاموں اور بشری تقاضوں کے تحت تمام سماجی گھما گھمی میں الجھا ہوا رہنے کے باوجود مشیتِ الٰہی ایک پل کے لئے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی اور داستان کے ہر موڑ پر بقول حالی۔ (کہ ہے ساری مخلوق کنبۂ خدا) پر یقین رکھتے ہوئے اپنے تصوفانہ انداز میں بلا تفریقِ مذہب و ملت حسنِ عمل کی تلقین و ترغیب دیتا چلتا ہے اور داستان کے ہر نیک و بد کردار کے عمل کو اجر و ثواب کے ترازو میں تولتا رہتا ہے"۔

(بیدماوت) کے علاوہ اس کتاب میں (١) صوفیائے کرام کی ادبی خدمات (٢) حیات بیدل کا تحقیقی جائزہ (٣) ساحر کی شاعری اور اسکا معنیاتی مطالعہ (۴) سردار جعفری کے نظریۂ فن پر اشتراکی عامہ (۵) ادیب مالیگاوی - ایک تہذیبی مطالعہ (٦) پروفیسر غلام دستگیر شہاب (٧) جنگ آزادی کی جدو جہد میں چکبست کا حصہ (٨) شوری یاد جوشی (٩) بیگم حضرت محل اور (١٠) چین کا حملہ اور اردو شاعری جیسے بلند پایہ مضامین ملتے ہیں جن سے منظور الحسن صاحب کے وسیع مطالعہ اور زبان و ادب کے متعلق اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ نہ صرف ایک کتاب ہے بلکہ ایک تذکرہ اور تنقید بھی ہے۔

• • •

میں زندہ ہوں

(مصنفہ محمد ایوب واقف)

تبصرہ از

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

زیر نظر کتاب محمد ایوب واقف کے دس تعارفی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا مضمون (میں زندہ ہوں) جو اُن کی اپنی آپ بیتی ہے اور جس میں ان کی زندگی کے حالات کے علاوہ کچھ اُن کی بھولی بسری یادیں بھی محفوظ ہیں، اس کے علاوہ آل احمد سرور، مجروح سلطانپوری، شبلی نعمانی، عصمت چغتائی، ظ انصاری، عزیز قیسی، قاضی نذر الاسلام اور قتیل شفائی ۔ مضامین اور آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ان کی کتاب (شعور و ادراک) ۔ ہند و پاک کے مختلف ادیبوں کے تاثرات ملتے ہیں۔

خوش قسمتی سے یہ سب وہ شاعر اور ادیب ہیں جن کو وہ بہت ہی قریب سے جانتے ہیں، جن کے ساتھ اُن کا نہ صرف اُٹھنا بیٹھنا ہے بلکہ اکثر علمی

و ادبی موضوعات پر اُن کا تبادلۂ خیال بھی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنا پر لکھا ہے۔

ان مضامین کو پڑھنے سے کچھ اچھی باتیں سامنے آتی ہیں۔ واقف صاحب اپنے اور مادر وطن کے ماضی کو بہت عزیز رکھتے ہیں، انھیں شکایت ہے کہ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان میں شاعری پر بحث زیادہ ہوتی ہے اور نثر نگاری پر کم، وہ گروہ بندیوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ آزادانہ طور پر سوچنے اور سمجھنے کے عادی ہیں۔ وہ جی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، ان کے اظہار میں انھیں کوئی پس و پیش نہیں ہوتا اور اُن میں مذہب پسندی زیادہ ہے شاید اُن کے مزاج کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے اُن کی تحریروں میں ایک بامقصد اور حقیقت پسندانہ انفرادیت پیدا کردی ہے اور وہ عام اور موجودہ تنقید نگاروں سے الگ نظر آتے ہیں دراصل اپنے سارے دوستانہ تعلقات کے باوجود انھوں نے مجروح سلطانپوری، عصمت چغتائی اور ظ انصاری پر جس بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا قاضی نذر الاسلام اور قتیل شفائی کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں وہ اُن کی غیر جانبدارانہ تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہیں۔

واقف ایوب صاحب ایک منجھے ہوئے نثر نگار ہیں، معیاری رسائل و اخبارات میں ان کے مضامین برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ مگر دوسروں کو سنانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے۔ اردو ادب میں واقف صاحب ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ذاتی طور پر بھی وہ نہایت نیک، شریف اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں، وہ دوستوں کی ادبی کمزوریوں کی نشاندہی پوری بے باکی سے کرتے ہیں مگر اُن کی دل آزاری کبھی نہیں کرتے۔ انھوں نے جو کچھ نام پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی دن و رات کی محنت سے پیدا کیا ہے اور گروہ بندیوں سے الگ رہ کر پیدا کیا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ اُن کی پچھلی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہوجائیگی اور اس طرح انھیں اُن کے خلوص کا صلہ ملیگا۔

• • •

مقالے

ادبیات

آزاد جگن ناتھ

زبان کی نشو و نما اور سرکار کی پشت پناہی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۴ع
جلد ۵۳، شمارہ ۳۹، ص ۱)

سرکاری پشت پناہی کے بغیر بھی زبان کی نشو و نما ہوسکتی ہے

ابراہیم یوسف

اردو ڈرامے کی شناخت کا مسئلہ (اشاریہ)

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ع، جلد ۳۴، شمارہ ۱۱، ص ۳-۷)

اردو ڈرامہ کی اہمیت اور اس کے پس منظر کا جائزہ۔

اصغر عباس

سر سید کے ابتدائی دس سال

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر، جلد ۱۳، شمارہ ۱۰-۱۱، ص ۴۲-۴۶)

سر سید کے بچپن کے حالات

آفتاب احمد

پروین شاکر

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴، جلد ۶۵، شمارہ ۱۲
ص ۱۲-۱۶)

پروین شاکر کی شاعری کا جائزہ

اکبر رحمانی

ڈاکٹر خلیق انجم سے گفتگو

(آموزگار جلگاؤں، ستمبر ۱۹۹۴ع، جلد

۱۳، شمارہ ۹، ص ۵ ـ ۱۱)

ڈاکٹر خلیق انجم کا تعارف اور تعلیمی مسائل پر اُن سے گفتگو۔

امان اللہ خاں

حسرت شیروانی

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۳۴، شمارہ ۱۱، ص ۲۳ ـ ۳۱)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں کا تخلص حسرت شیروانی تھا ان کی شاعری کا جائزہ

امانی خالد ظہیر

ہندوستان میں اردو زبان کی حیثیت

(اخبار اردو، اسلام آباد، اگست ۱۹۹۴ ع جلد ۱۱، شمارہ ۸، ص ۱۲ ـ ۱۹)

ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورت حال کا سرسری جائزہ۔

انور خان

پنجاب کا البیلا ـ بلونت سنگھ

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ٦، بلونت سنگھ نمبر، ص ۴۵ ـ ۴۸)

بلونت سنگھ کے افسانوں کی بعض خصوصیات کا جائزہ۔

اوپندر ناتھ اشک

بلونت سنگھ ـ شخصیت اور فن

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ٦، بلونت سنگھ نمبر، ص ۹ ـ ۲۰)

بلونت سنگھ کے فن اور شخصیت کا جائزہ۔

بلراج کومل

ایک خط ناتھی ہزار

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴ ع، جلد ٦۵، شمارہ ۱۰، ص ۲۱ ـ ۳۵)

ترقی پسندی اور جدیدیت نے اردو شاعری کو کیا دیا اس کا جائزہ۔

حسین الحق

بلونت سنگھ ـ بحیثیت قصہ گو

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ٦، بلونت سنگھ نمبر، ص ۴۹ ـ ۵۵)

بلونت سنگھ کا ذکر بحیثیت قصہ گو۔

حامدی کشمیری

اقبال کی نظم شعاع آفتاب، تجزیاتی مطالعہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ٢٢ اکتوبر ١٩٩٤ ع
جلد ٥٣، شمارہ ٤٠، ص ٨)

بانگ درا کی مشہور نظم شعاع آفتاب
کا علمی ادبی تجزیہ۔

خواش، بدر عالم

موجودہ ادبی صورت حال

(شاعر بمبئی ١٩٩٤ ع، جلد ٦٥، شمارہ
١١، ص ٦ - ٩)

اردو ادب کی موجودہ صورت حال کا
جائزہ اور اس کی کمیوں کی نشاندھی۔

رام پرکاش اشک

مہاتما گاندھی اور اردو ادب

(آجکل نئی دہلی، اکتوبر ١٩٩٤ ع، جلد
٥٣، شمارہ ٣، ص ٣ - ٥)

گاندھی جی کی سیاسی، سماجی اور
لسانی خدمات کا تذکرہ۔

رشید حسن خان

گلزار نسیم کی لسانی اہمیت

(آجکل نئی دہلی، دسمبر ١٩٩٤ ع، جلد
٥٣، شمارہ ٥، ص ٣ - ٧)

گلزار نسیم کا ادبی و لسانی جائزہ۔

رفیعہ شبنم

ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی،
(مجروح اپنی غزل کے آئینے میں)

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ١٩٩٤ ع، جلد
٣٤، شمارہ ١١، ص ٤١ - ٥١)

مجروح سلطانپوری کی غزل گوئی کا
جائزہ۔

سکسینہ ویریندر پرشاد

مثنوی پیام ساوتری

(ہماری زبان نئی دہلی، ١٥ جنوری ١٩٩٥ ع
جلد ٥٤، شمارہ ٣، ص ٣)

مثنوی پیام ساوتری کا ادبی جائزہ۔

سید فرخ جلالی

سر سید کے چند ساتھی
(١٨٦٤ ع سے ١٨٧٤ ع تک)

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر
١٩٩٤ ع، جلد ١٣، شمارہ ١٠ - ١١،

ص ۴۷ ـ ۵۰)

سرسید کے اُن رفقاء کا ذکر جنھوں نے ۱۸٦۴ع سے ۱۸۷۴ع تک ان کے ساتھ کام کیا اور ان کے کاموں میں مدد دی۔

شارب ردولوی

ہم عصر اردو تنقید، چند مسائل

(شاعر بمبئی، جلد ٦۵، شمارہ ۵، مئی ۱۹۹۴ع، ص ۷ ـ ۱۰)

ہم عصر اردو تنقید کا جائزہ اور اس سے متعلق چند مسائل کا ذکر

صدیقی افتخار امام

خوشبو کھے پر کتر کے گیا راستہ کہاں

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴ع، جلد ٦۵، شمارہ ۱۲، ص ۴ ـ ۵)

پاکستانی شاعرہ پروین شاکر اور ان کے مجموعہ کلام (خوشبو) کا تعارف

صدیقی عظیم الشان

خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری

(آجکل نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۴ع، جلد ۵۳، شمارہ ۳، ص ۸ ـ ۱۲)

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا جائزہ

صدیقی کمال احمد

عروض معروض (غالب کی ایک رباعی)

(آجکل نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۴ع، جلد ۵۳، شمارہ ۳، ص ۱۹ ـ ۲۳)

غالب کی ایک رباعی کا ہی جائزہ عروض کے نقطہ نظر سے

صغیر خان

کشمیر اور اردو

اخبار اردو، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۹۴ع جلد ۱۱، شمارہ ۱۲، ص ۱۰ ـ ۱۳)

کشمیر میں اردو کی مقبولیت کا جائزہ۔

طیب انصاری

آصف جاہ ثانی کے عہد میں اردو نثر کا ارتقاء

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ع جلد ۵۳، شمارہ ۴۷، ص ۱ ـ ۲)

آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں اردو نثر کی جو ترقی ہوئی اس کا جائزہ تاریخی پس منظر کے ساتھ۔

آصف جاہ ثانی کے عہد میں اردو نثر کا ارتقاء

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۴ ع جلد ۵۳، شمارہ ۴۸، ص ۲-۲)

مذکورہ مضمون کی دوسری قسط

عابد صبا نوبدی

غالب کا ایک ہم عصر، لطیف آرکانی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جنوری ۱۹۹۵ ع جلد ۵۴، شمارہ ۲، ص ۲)

لطیف آرکانی کے حالات زندگی اور اس کی شاعری کا تعارف

علامہ ندوی ناقوی مرحوم کا فکری سفرنامہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۴ ع جلد ۵۳، شمارہ ۴۸، ص ۸)

ندوی ناقوی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا تعارف۔

علامہ ندوی ناقوی مرحوم کا فکری سفرنامہ

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جنوری ۱۹۹۵ع جلد ۵۴۔ شمارہ ۱، ص ۳)

مضمون کی دوسری اور آخری قسط۔

عرفان حبیب

سر سید احمد خاں اور تاریخ نویسی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۳، شمارہ ۱۰ - ۱۱، ص ۵۲ - ۵۶)

تاریخ نویسی کے سلسلہ میں سر سید احمد خاں کی خدمات کا تذکرہ۔

فاروقی شمس الرحمٰن

شعر شور انگیز

(شب خون الہ آباد جلد ۲۸، شمارہ ۱۷۷، ص ۱۹ - ۳۸)

میر کے اشعار کی شرح (جاری)

شہریار کی نئی شاعری

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴، جلد ٦۵، شمارہ ۹، ص ۱۴ - ۱۷)

شہریار کی نئی شاعری پر ایک تنقیدی نظر۔

بلونت سنگھ کے کچھ افسانے

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ٦ بلونت سنگھ نمبر، ص ۲٦-۳۱)

بلونت سنگھ کے کچھ افسانوں کا
سماجی و ادبی جائزہ۔

فرمان فتح پوری

اردو واسوخت

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴، جلد ۶۵، شمارہ ۸، ص ۸ - ۱۴)

اردو شاعری کی ایک صنف واسوخت کا مفصل جائزہ

کرامت علی کرامت

ڈاکٹر ستیا کانت مہاپاترا - فن اور شخصیت

(آجکل نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۳، ص ۸ - ۱۵)

۱۹۹۴ ع کا گیان پیٹھ ایوارڈ اڑیہ زبان کے مشہور شاعر ستیا کانت مہاپاترا کو ملا ہے۔ مضمون میں ان کے حالات زندگی اور شاعری کا جائزہ ہے۔

گوریکر نظام الدین

سرسید کا تعلیمی نظریہ اور سرگرمیاں

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر ۱۹۹۴ ع، شمارہ ۱۰-۱۱، ص ۹۸-۱۰۲)

سرسید کی تعلیمی خدمات کا جائزہ۔

محمد بدیع الزماں

علامہ اقبال اور مغربی مفکرین

(ہوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۴۴، شمارہ ۲، ص ۱۵ - ۴۵)

مذکورہ مضمون کی آخری قسط۔ اس میں اقبال اور نیٹشے، اقبال اور برگساں، اقبال اور شوپنہار کے افکار کا باہمی مقابلہ کیا ہے

اقبال کے کلام میں قیصر کی اصطلاح

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴، شمارہ ۶، ص ۴۶۲ - ۴۷۲)

اقبال نے اپنے اشعار میں قیصر کا لفظ اکثر استعمال کیا ہے۔ قیصر سے اقبال کی کیا مراد تھی اس کی وضاحت۔

محمد بہادر علی

اردو زبان اور مشترکہ تہذیب

(ہوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، ج ۴۴، شمارہ ۲، ص ۱ - ۷)

اردو زبان کو مشترکہ تہذیب کی د قرار دیا ہے

محمد عمر

سر سید کی تحریک کا تاریخی پس منظر

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۶۳، شمارہ ۱۰ - ۱۱، ص ۳۷ - ۴۱)

غدر کے حالات اور اِن حالات میں سر سید کی خدمات کا ذکر۔

محمد نعمان

سر سید احمد، علی گڑھ کالج اور بھوپال

(کتاب نما نئی دہلی، فروری ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۵۸ - ۶۸)

علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں بھوپال کے حصہ کا ذکر، خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کالج کی مناسبت سے۔

محمد قمر الہدیٰ

ایک نظر میں

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۶ بلونت سنگھ نمبر۔ ص ۳ - ۴)

بلونت سنگھ کے حالات زندگی اور اُن کی ادبی تخلیقات کا ذکر۔

منظر عابد حسن

ایک افسانہ نگار : بلونت سنگھ

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۶ بلونت سنگھ نمبر، ص ۶۵ - ۷۰)

بلونت سنگھ کے افسانوں کا ادبی تجزیہ

ماتھوی رام لعل

بہار دانش

(معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴، شمارہ ۴، ص ۲۹۱ - ۳۰۱)

شیخ عنایت اللہ کمبو کی بہار دانش کا تعارف اور اس کے ۷۵ نسخوں کی تفصیل۔

نامی انصاری

مرثیے کی سماجیات پر ایک نظر

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴ ع، جلد ۶۵، شمارہ ۱۰، ص ۶ - ۹)

مرثیہ کی تاریخ اور اس میں موجود سماجی عناصر کا جائزہ۔

وارث علوی

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کے چند پہلو

(آجکل نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد

۵۳، شمارہ ٦ بلونت سنگھ نمبر، ص
۳۲-۳۷)

بلونت سنگھ کے دو افسانے پودے اور پہلا پتھر کی روشنی میں ان کے افسانوں کے بعض اہم پہلوؤں کا ذکر

اسلامیات

اصلاحی ضیاء الدین

امام رازی کی تفسیر کبیر میں ربط آیات

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۵ ع،
جلد ۱۵۵، شمارہ ۱، ص ۵-۳۵)

امام رازی کی تفسیر کبیر کی خصوصیات کا ذکر اور ربط آیات کے سلسلہ میں ان کے بلاغت کی تفصیل،

امام رازی کی تفسیر کبیر میں ربط آیات

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۵ ع،
جلد ۱۵۵، شمارہ ۲، ص ۸۵-۱۰۹)

مقالہ کی دوسری قسط، تفسیر کبیر میں ربط آیات کے مسئلہ پر مزید بحث۔

اصلاحی ابو سفیان

مصطفیٰ صادق الرافعی

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۵ ع،
جلد ۱۵۵، شمارہ ۱، ص ۳٦-۵۲)

یہ مقالہ کی دوسری قسط ہے اور اس میں رافعی کے معاشرتی، تاریخی مقالات کا ذکر ہے

اکرام کاوش

سلطنت خدا داد کا ایک نایاب مخطوطہ تذکرۃ البلاد والحکام

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۴ ع،
جلد ۵۳، شمارہ ۳۹، ص ۸)

میر حسین علی کرمانی وقائع نگار دربار نواب حیدر علی خان بہادر و ٹیپو سلطان شہید، کی لکھی ہوئی کتاب تذکرۃ البلاد والحکام کا تعارف۔

سید وحید اشرف

اقبال کی فارسی شاعری پر ایک اجمالی نظر

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۵۵ ع،
جلد ۱۵۵، شمارہ ۲، ص ۱۲۴-۱۳۲)

اقبال کے فارسی کلام کے مجموعوں کا تعارف اور ان کی فارسی شاعری کا جائزہ۔

محمد سہراب

ماضی میں مدارس کی نصابی روایات

(آموزگار جلگاؤں، ستمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۳، شمارہ ۱۱، ص ۹ - ۱۸)

ماضی میں ہندوستان میں رائج اسلامی تعلیمی نظام کا تعارف، درجہ اور نصاب کی تفصیل کے ساتھ۔

عبید اللہ

کتب خانۂ مدرسہ محمدی مدراس میں ملا عبد العلی بحر العلوم کی تصنیفات

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۲، ص ۱۳۳ - ۱۴۷)

ملا عبد العلی بحر العلوم کے ان فارسی و عربی مخطوطات کا ذکر جو کتب خانہ مدرسۂ محمدی میں محفوظ ہیں

ندوی محمد اجتباء

امام محمد ادریس شافعی

(البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵، شمارہ ۵، ص ۴۹ - ۵۱)

امام شافعی کے حالات زندگی

امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت

(البلاغ بمبئی، نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۵، شمارہ ۴، ص ۳۵ - ۳۹)

امام ابو حنیفہ کے حالات زندگی۔

ندوی مختار احمد

شریعت اسلامیہ میں تصویر کا حکم

(البلاغ بمبئی، نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۵، شمارہ ۴، ص ۱۹ - ۲۳)

تصویر کشی اسلامی نقطۂ نظر سے

ندوی، حامد اللہ

داؤدی بوہرہ اور اُن کی لسان الدعوۃ

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۲، ص ۱۱۰ - ۱۲۳)

داؤدی بوہروں کا ذریعۂ تبلیغ و تعلیم گجراتی ہے مگر وہ اس کو عربی رسم الخط میں لکھتے ہیں اس مضمون میں اس کی تفصیلات ہیں۔

نشیط سید یحییٰ

خانقاہی نظام تعلیم اور اصلاح نسواں (اردو شاعری کے پس منظر میں)

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۱، ص ۵۲ - ۶۳)

صوفیائے کرام نے اپنی شاعری کے ذریعہ

اصلاح نسواں کا جو بیڑا اٹھایا اس کی تفصیلات۔

قاسمی محمد مسعود عالم

سر سید اور عشق رسول

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر - نومبر ۱۹۹۴ء، جلد ۱۳، شمارہ ۱۰-۱۱، ص ۳۱-۳۶)

سر سید کو رسول اکرم سے جو محبت تھی، اُن کی تصانیف کی مدد سے اس کا جائزہ لیا ہے۔

شخصیات

ادارہ

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرحوم

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۵ء، جلد ۱۵۵، شمارہ ۱۰، ص ۷۳-۷۴)

اردو کے نامور استاد، محقق و نقاد اور ماہر لسانیات، ڈاکٹر ابو اللیث کے حالات زندگی ستمبر ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہوا

جناب معین احمد علوی کاکوروی

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۵ء، جلد ۱۵۵، شمارہ ۱، ص ۷۵)

معین احمد علوی کاکوروی مرحوم کے حالات زندگی۔

احمد محی الدین

محمد مارما ڈیوک پکتھال

(سب رس حیدر آباد، ستمبر ۱۹۹۴ء، جلد ۵۶، شمارہ ۹، ص ۱۹-۳۰)

قرآن مجید کے مشہور انگریزی مترجم محمد مارما ڈیوک پکتھال کے حالات زندگی اور اُن کی تصانیف کا ذکر۔

اصلاحی، ابو سفیان

مصطفےٰ صادق الرافعی

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۴ء، جلد ۱۵۴، شمارہ ٦، ص ۴۳۳-۴۴۱)

شامی النسل مصری عالم مصطفےٰ صادق الرافعی کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا ذکر۔ جنھوں نے مصر کے مغرب زدہ طبقہ کے اسلام کے خلاف اعتراضات کا مُسکت جواب دیا۔

اعظمی محمد فاروق

مولانا عبدالسلام کا ذوق شعری

(البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۵ ع، جلد ۵، شمارہ ۵، ص ۳۹ ـ ۴۲)

عبدالسلام ندوی کے حالات زندگی اور ان کے ذوق شعری کا تجزیہ۔

آل احمد سرور

علم شرح، تعبیر اور تدریس متن پر کچھ خیالات

(شب خون الہ آباد، جلد ۲۸، شمارہ ۱۷۸، ص ۳ ـ ۸)

علم شرح، تعبیر اور تدریس متن پر اظہار خیال۔

الیاس الاعظمی

امام ابو عمرو زبان بن العلا بصری

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴، شمارہ ٦، ص ۴۴۳ ـ ۴٦۳)

فن قرأت کے ماہر ابن العلاء بصری کے حالات زندگی، اور ان کے علم و فضل کا ذکر۔

صدیقی عادل

(آموزگار مالگاؤں، دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۳، شمارہ ۱۲۰، ص ۱۲ ـ ۱٦)

رفیع احمد قدوائی کے حالات زندگی اور ان کی سیاسی خدمات کا جائزہ۔

دسنوی عبدالقوی

دیدہ و شنیدہ
(ایک دیدہ ور کی خودنوشت)

(کتاب نما نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۳۴، شمارہ ۱۱، ص ٦۴ ـ ٦۹)

(دیدہ و شنیدہ) سید شہاب الدین دسنوی کی خودنوشت ہے۔ اس مضمون میں ان کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

محمد علی اثر

مولانا محمد باقر آگاہ
(جدید تحقیق کی روشنی میں)

(سب رس حیدر آباد، اگست ۱۹۹۴ ع، جلد ۵٦، شمارہ ۸)

دکنی شاعر و ادیب باقر آگاہ کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کا تعارف۔

رفیع احمد قدوائی مجتبیٰ حسین

٦٤٠ سال بعد منظر عام پر آنے والی
ایک نادر کتاب

(کتاب نما، نئی دہلی، فروری ١٩٩٥ ع، جلد ٣٥، شمارہ ٢، ص ٣٤ ـ ٣٦)

حضرت نظام الدین اولیاء کے حالات زندگی پر مشتمل ایک نادر کتاب "قوام العقائد" کا تعارف جس کو نثار احمد فاروقی نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔

غزالی مظفر حسین

دینی مدارس کے اساتذہ اور فن تعلیم و تربیت

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ١٩٩٤ ع، جلد ١٥٤، شمارہ ٥، ص ٣٧٥ ـ ٣٨٢)

دینی اور عصری مدارس کے طریقہ تدریس کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ ہم عصری طریقہ تعلیم و تربیت سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں

غلام مصطفیٰ خان

پروفیسر منظور حسین شور صاحب

(معارف اعظم گڑھ، فروری ١٩٩٥ ع، جلد ١٨٥، شمارہ ٢، ص ١٤٠ ـ ١٤٧)

شور کے حالات زندگی اور اُن کے انتقال پر اظہار افسوس۔

فضل احمد

دین کی تبلیغ میں نبی اکرم کا ابلاغی طریقۂ کار

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ١٩٩٤ ع، جلد ١٥٤، شمارہ ٥، ص ٣٥١ ـ ٣٧٤)

نبی اکرم نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا اس کی تفصیل

کاظم علی خان

حیرت الہ آبادی

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم نومبر ١٩٩٤ ع، جلد ٥٣، شمارہ ٤١، ص ١)

حیرت الہ آبادی کے حالات زندگی اور اُن کی شاعری کا تعارف۔ پہلی قسط۔

ندوی، ریحان خان

مغربی افکار کی یورش اور علامہ

شبلی کا کارنامہ

(معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴، شمارہ ۵. ص ۳۲۵ ـ ۳۵۰)

مغربی افکار کی یورش کو روکنے کے لئے شبلی نعمانی نے زبان و قلم سے جو جہاد کیا اس کی تفصیل

محی الدین کٹی

سید محمد سرور ۔ ایک مختصر تعارف

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۴۶ ص ۳)

کیرالا کے مشہور اردو شاعر سید محمد سرور کا تعارف

مختار الدین احمد

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۴۶، ص ۱ ـ ۲)

«لکھنؤ کا دبستان شاعری» کے مصنف ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرحوم کے حالات زندگی اور اُن کی تصانیف کا ذکر.

ندوی، عمیر الصدیق

اسفراین کے دو شافعی فقیہ امام ابو اسحاق اسفراینی و امام ابو حامد اسفراینی

(معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴، شمارہ ۴، ص ۲٦٦ ـ ۲۹۰)

امام ابو اسحاق اسفراینی اور ابو حامد اسفراینی کے حالات زندگی اور اُن کی تصانیف کا تعارف

قاضی اطہر مبارکپوری

مدینۃ منورہ کی علمی و دینی مجالس

(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۵۴ شمارہ ٦، ص ۴۰۵ـ۴۳۲)

عہد صحابہ و تابعین میں مدینۃ منورہ میں جو علمی و دینی مجالس منعقد ہوتی تھیں ان کی تفصیلات.

مسعود حسن خاں

پروفیسر عبد الستار صدیقی ـ ایک تعارف

(اخبار اردو اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۴ ع،

جلد ۱۱، شمارہ ۱، ص ۹ ـ ۱۱)

پروفیسر عبدالستار صدیقی کا تعارف عربی، فارسی اور اردو کے مسلم الثبوت استاد کی حیثیت سے اور اُن کے مقالات و مضامین کی تفصیل۔

متفرقات

اطہر فاروقی

احتراالایمان سے بات چیت

(شب خون الہ آباد، جلد ۲۸، شمارہ ۱۷۸، ص ۳۵ ـ ۴۰)

اردو شاعری کی خصوصیات پر ایک بحث

آغا سہیل

افسانہ اور عصری آگہی

(شاعر بمبئی جولائی ۱۹۹۴ ع، جلد ۶۵، شمارہ ۷، ص ۲۰ ـ ۲۶)

ہیئت اور مواد کے اعتبار سے صنف افسانہ نے ہر دور میں اس کے عمرانی، تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل کی جو عکاسی کی ہے اس کا تعارف

خالد محمود

ہندوستان میں اردو مسائل کے دو رخ

(کتاب نما نئی دہلی، فروری ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۳ ـ ۸)

اردو کی حمایت میں اُٹھنے والی آوازوں کا دائرہ، اور اس کی حق تلفیوں کا ذکر۔

شاداں دکاء الدین

نئی اصناف ادب کا محاسبہ

(شاعر بمبئی، مئی ۱۹۹۴ ع، جلد ۶۵، شمارہ ۵، ص ۲۵ ـ ۲۷)

آزاد غـــزل، نثری نظم، ہائیکو اور انشائیوں پر ایک تنقیدی نظر۔

شفق سوپوری

موسیقی، جمالیات اور نفسیات

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴ ع، جلد ۶۵، شمارہ

۹۰، ص ۲۶ - ۲۹)

موسیقی، جمالیات اور بصریات کے باہمی تعلق سے بحث.

شہاب سرمدی

ہمارا کلاسیکی سنگیت

(شاعر بمبئی ۱۹۹۴، جلد ۶۵، شمارہ ۹، ص ۶ - ۷)

کلاسیکی سنگیت کی وضاحت اور اس کا تعارف.

شریف حسین قاسمی

ہندوستان میں دیوان حافظ کے مخطوطے

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۴ع، جلد ۴۴، شمارہ ۲، ص ۴۶ - ۵۴)

ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ دیوان حافظ اور انتخاب دیوان حافظ کے ۱۵۴ مخطوطوں کا ذکر.

شمیم حنفی

نثری نظم کا مسئلہ

(شاعر بمبئی، جولائی ۱۹۹۴ع، جلد ۶۵، شمارہ ۷، ص ۷ - ۱۹)

اردو ادب کی ایک نئی صنف سخن نثری نظم پر ایک بحث.

صدیقی ظفر احمد

بلاغت کی بعض اصطلاحیں

(شب خون الہ آباد، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۰، ص ۱۳ - ۲۷)

بلاغت کی بعض اصطلاحوں کی تشریح اردو، فارسی اور عربی مثالوں کے ساتھ.

صدیقی عقیل احمد

تعبیر اور تنقید

(شب خون الہ آباد، جلد ۲۹، شمارہ ۱۷۹، ص ۴۵ - ۵۲)

اردو ادب میں تعبیر و تنقید کی اہمیت پر ایک بحث.

عصمت جاوید

اقبال کا ایک شعر اور پروفیسر رشید احمد صدیقی

(کتاب نما نئی دہلی، فروری ۱۹۹۵، جلد ۳۵، شمارہ ۲، ص ۱۱ - ۱۳)

اقبال کے ایک شعر

سمجھے نہ ساقی مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمیٔ محفل ہے حرف معذوری

کی شرح

فاروقی شمس الرحمٰن

شعر شور انگیز

(شب خون الہ آباد، جلد ۲۹، شمارہ ۱۷۹، ص ۱۱ - ۳۰)

میر کے اشعار کی شرح (جاری)

قیوم صادق

اردو میں تحقیق

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۴۴، شمارہ ۲، ص ۸ - ۱۴)

اردو میں تحقیق کے آغاز اور اس کے ضروری عناصر پر روشنی۔

وزارت رسول خاں

حکومت اتر پردیش کا نیا حکم نامہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے لئے خطرے کا سگنل

(آموزگار حلگاؤں، ستمبر ۱۹۹۴ ع، جلد ۱۳، شمارہ ۹، ص ۱٦ - ۱۸)

حکومت اتر پردیش کی جانب سے جاری کئے گئے تعلیمی Ed P S Cr O مورخہ یکم جنوری ۱۹۹۴ ع کا جائزہ

• • •

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

- لمعات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ایسیز (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبدکوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈوایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)
- انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
- مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)

جناب عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری
مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
مقالہ نما مرتبہ محترمہ رفیہ انعامدار

نوائے ادب، بمبئی

FORM : IV - ROLL NO : VIII

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰		Registration No 32009/50
مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر		جناب عبدالمجید پالکا، بی کام (آنرز)
قومیت		ہندوستانی
پتہ		انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر		
قومیت		ایضاً
پتہ		
نام ایڈیٹر		پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ		ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

• • •

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof N S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Bombay 400 001

•

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs. fifty • Foreign . £ 10

نوائے ادب ممبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۴۵ — شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۹۵ ع

مندرجات

احوال واقعی

نوائے ادب کے شمارہ کا انتساب

نوائے ادب کے اس شمارے کو ہم عروج سلطان پوری صاحب کے نام سے معنون کرتے ہیں اور سیمینار کی مفصل روداد اس شمارہ میں شامل کررہے ہیں تاکہ اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہو اور قارئین اس سے استفادہ کریں۔

بیرسٹر انتولے صاحب کی تشریف آوری۔

مرکزی حکومت کے وزیر صحت کی حیثیت سے محترم بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے صاحب نے ہمارے [illegible] صدر ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب کی دعوت پر انجمن کے [illegible] پروگرام میں شرکت کی اور مہاراشٹرا کے خصوصی ایڈوکیٹ جنرل [illegible] مہمان اعزازی کی حیثیت سے اس جشن میں شریک ہوئے۔ انتولے صاحب انجمن اسکول کے سابق طالب علم اور انجمن اسلام کے صدر رہ چکے ہیں اور ان کے دور صدارت میں انجمن کا نیا دستور ترتیب دیا گیا اور [illegible] کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ۱۹۷۵ ء میں ڈاکٹر ایس ایس گوریکر صاحب کا تقرر سرکاری طور پر یونیورسٹی کی منظوری سے کیا گیا۔ انتولے صاحب کا خیر مقدم ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے بہترین انداز میں کیا اور انکے تمام اوصاف و کمالات پر روشنی ڈالی۔ بیرسٹر انتولے صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں انجمن کا نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ یہ کہا کہ اس ادارے کی وجہ سے میں اس [illegible] جو کچھ ہوں اور جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے اس کے لئے میں اسکول کے صدر مدرس جناب [illegible] صاحب اور اساتذۂ کرام اور انجمن کے متعلقین کا شکر گذار ہوں جنہوں نے ہر وقت، ہر حال میں اور ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔ میں اس ادارے کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور ببانگ دھل کہہ رہا ہوں کہ میں اس ادارے کی ہر طرح کی خدمت کے لئے حاضر ہوں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرتا رہونگا۔ میری نیک خواہشات اور دلی تمنائیں اس ادارے کے ساتھ ہیں۔ جناب موصوف کے بعد مہمان خصوصی نے انتولے صاحب کا تعارف اپنے

انداز میں ایک پرانے ساتھی اور دوست کی حیثیت سے کرایا اور ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن اسلام نے شروع سے آج تک اپنی غیر فرقہ وارانہ حکمت عملی کو قائم رکھا ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے مطلق جھجک محسوس نہیں ہوتی بلکہ خوشی ہورہی ہے کہ اس مسلم ادارے کی سیکولر پالیسی قابل تحسین ہے اور ہندوستان کے دیگر ادارے بھی اس کی تقلید کریں اور اس پر عمل پیرا ہوجائیں جنرل سیکریٹری جناب پالکا صاحب نے شکریہ ادا کیا یہ جلسہ انجمن اسلام کی تاریخ میں بہت ہی کامیاب جلسہ رہا۔ بعد میں عشائیہ کا اہتمام کیا گیا اور اسطرح یہ جلسہ انجام پذیر ہوا۔

مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) کے چانسلر کی تقریر۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر اے ایم خسرو صاحب انجمن کے ایک جلسہ میں تشریف لائے اور اقتصادی پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اسلام نے ہمیشہ ترقی کے مراحل طے کرنے کے سلسلہ میں اقتصادی پہلو کو مضبوط کرنے پر زور دیا ہے اور مزید یہ کہا بغیر اقتصادیات کے ہم زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ترقی نہیں کرسکتے ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب نے صدارتی خطبہ دیا اور انجمن کے بارے میں پوری معلومات بہم پہنچائیں شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

اردو میں ایک اور ڈاکٹریٹ

اگست ۱۹۹۵ء میں جناب سید مدار شاہ کے اردو مقالہ کو بمبئی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کے لئے منظور کرلیا ہے۔ سید صاحب نے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے طالب علم کی حیثیت سے اپنا اردو مقالہ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر این ایس گوریکر صاحب کی نگرانی میں مرتب کیا سید شاہ صاحب انسٹی ٹیوٹ کے آٹھویں ڈاکٹر ہیں

(پروفیسر) این ایس گوریکر
(مدیر)

مجروح سلطان پوری
کا
ادبی سفر

مجروح سلطان پوری کا ادبی سفر

یک روزہ سیمینار

(ڈاکٹر طاہرہ فارسی)

•

خوشی کی بات ہے کہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے زیر اہتمام سنیچر ۱۴ جنوری ۱۹۹۵ء کو اکبر پیر بھائی آڈیٹوریم میں زبان اردو کے میر، اردو شاعری کے غالب، غزلگوئی کے ذوق، ترقی پسند ادب کے جوش اور نئے رجحانات کے فیض، محترم اسرار حسن مجروح سلطان پوری کے اعزاز میں یک روزہ سیمینار "مجروح سلطان پوری کا ادبی سفر" کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ صدارت انجمن اسلام کے فعال صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب نے فرمائی۔ اس سیمینار میں ہندوستان گیر شہرت کے دانشوروں میں ڈاکٹر یوسف سرمست، عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد)، پروفیسر عبدالقوی دیسنوی، سابق صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج (بھوپال) اور ڈاکٹر آدم شیخ سابق صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج (بمبئی) نے اپنے پرمغز اور بصیرت افروز مقالوں سے قارئین کرام کو محظوظ کیا۔ لکھنؤ سے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکے اگرچہ انہوں نے سیمینار میں شرکت کرنے کا وعدہ فرمایا تھا بہر کیف، سیمینار ہر طرح کامیاب رہا اور خصوصاً مہمان خصوصی مجروح سلطان پوری کے جوابی ارشادات سے خواتین و حضرات بہت خوش ہوئے اور انکی خدمات کا اعتراف کر کے انہیں اعزازات سے نوازا۔

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر نظام الدین ایس گوریکر نے استقبالیہ کلمات، صدر جلسہ ڈاکٹر ایم اسحاق جمخانہ والا نے صدارتی خطبہ اور محترم مجروح سلطان پوری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے جوابی ارشادات سے حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض پرنسپل شفیق عباس نے انجام دئیے اور صدر جلسہ نے اختتامی تقریر کے بعد حاضرین جلسہ کی چائے سے خاطر تواضع کی گئی

استقبالیہ کلمات

(پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر)

•

اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر مرزا غالب اپنے محسن کے ورود مسعود کے سلسلے میں اگر یوں فرماتے ہیں کہ ع

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

تو ہم اپنے ماحول کے اعتبار سے محترم مجروح سلطان پوری کی تشریف آوری کو حق کے اعزاز میں اس بزم مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اپنے لئے عزت کا باعث ہی نہیں بلکہ ہماری قدرافزائی کا سبب تصور کرتے ہیں۔ مجروح صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ہمارے اردو انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر لبیک کہکر ہماری عزت کو بڑھایا اور پچاس سالہ اردو خدمت بالخصوص صنف غزل میں انکے مقام کو متعین کرنے کا اعزاز فراہم کیا اور ان کا اعتراف کرنے کا ہمیں زرین موقع عطا کیا

ہم ایک مرتبہ اور مجروح صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انکا خیر مقدم کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں

اس ضمن میں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے کہ ہماری انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب کی ایما پر اس سیمینار کو اعلیٰ پیمانہ پر منعقد کیا گیا ہم ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی اردو دوستی اور ادب نوازی کی وجہ سے ہم مجروح سلطان پوری کا خیر مقدم کرنے کے لائق ہوئے جو دراصل میر اردو، ذوق ادب اور داغ غزل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم انکی خدمت میں ہدیۂ تشکر اور مبارکباد پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مجروح سلطانپوری جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں اور جنکی ہمہ

اوصاف شخصیت نے گذشتہ نصف صدی میں غزل جیسی نازک اور مقبول صنف شاعری کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرکے غزل کو نیا رنگ دیا اور چار چاند لگائے اور بقول خود (مجروح صاحب) ــــ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ آتے ہی گئے اور کارواں بنتا گیا

دراصل مجروح صاحب کی مسلسل کوششوں نے اردو غزل کو وہ مقام عطا کیا ہے جو اردو شاعری کی جان ہے۔ ایک طرف انھوں نے فلم کے توسط سے غزل کو مقبول کیا تو دوسری جانب غزل کو صحیح درجہ دیکر دنیائے اردو میں تہلکہ مچا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل اور مجروح یک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔

اس سیمینار کے انعقاد پر ہمارے محترم صدر ڈاکٹر حمید اللہ والا صاحب خصوصی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کیونکہ وہ دلچسپی نہ لیتے تو شاید اس سیمینار کا انعقاد ممکن نہ ہوتا۔ ہم اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر عبدالقوی دیسنوی اور ڈاکٹر آدم شیخ کے بھی شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول فرمایا اور وہ اپنے مقالوں سے حاضرین کرام کو محظوظ کرینگے۔

ہم ان کے بھی ممنون ہیں اور استقبال کرتے ہیں اور آپ سب خواتین و حضرات کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں کہ آپ نے شریک بزم ہوکر ہمارے جلسہ کی رونق کو دوبالا کیا۔

آخر میں ایک مرتبہ اور مہمان خصوصی مجروح صاحب کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو مختصر کرتا ہوں اور اب ممتاز قلمکاروں، معزز دانشوروں اور فاضل مقالہ نگاروں کے درمیاں حائل ہونا نہیں چاہتا اور صدر جلسہ سے بصد ادب التماس کرتا ہوں کہ وہ جلسہ کا آغاز اپنے خطبہ سے کریں۔

خدا حافظ!

●

خطبۂ صدارت

(ڈاکٹر محمد اسحاق صمدانہ والا صاحب)

ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں کہ ہمارے ملک کے نامور شاعر محترم عروج سلطان پوری صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہماری دعوت پر آج کے 'یوم عروج' کے تعلق سے اس سیمینار میں تشریف لا کر ہمیں خصوصی طور پر میدان غزل میں اپنی پچاس سالہ خدمت کا اعتراف کرنے کا زریں موقع عنایت فرمایا اور اسی طرح انجمن اسلام جیسے سوا سو سالہ قدیم تعلیمی و ثقافتی ادارے کی جانب سے ندرانۂ عقیدت پیش کرنے کا اعزاز بخشا ہم سب سے پہلے ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور 'دادا فالکے' صاحب فلمی ایوارڈ سے نوازے جانے پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جسطرح اردو غزل کے سنوارنے میں انھوں نے پچاس سال تک جو مسلسل جد و جہد کی اور مشکلات کا مقابلہ کیا اسی طرح آج کے دور میں بھی فلمی دنیا کے ذریعہ اردو زبان کو مقبول بنانے اور رابطے کی زبان بنانے میں وہ ہر ممکنہ سعی کریں گے

عروج صاحب غزل گو ہی نہیں بلکہ ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جو گذشتہ پچاس سال سے غزل کی دنیا میں چھائے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اُس وقت غزل کو زندہ رکھا جب ہر طرف ترقی پسند کا بول بالا تھا نظم ایک محبوب صنف سخن بنی اور غزل کہنے کی اگر کوئی جرأت کرتا تو وہ معتوب سمجھا جاتا دراصل عروج صاحب طبقے سے کے باوجود بھی غزل سرائی سے دستبردار نہیں ہوئے اور اس صنف کو نئی نسل تک پہنچایا اور یہ وہ احسان ہے جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا غزل نے ان کے ساتھ وفاداری کی اور انھیں زندۂ جاوید بنا دیا اور آج بھی ہر محفل انکی دلپذیر آواز سے گونجتی ہے

انجمن اسلام کا قیام ۱۹۷۴ء میں عمل میں آیا اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام سماجی حالت اور اخلاقی کردار اسکے بنیادی مقاصد تھے مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ آج یہ ادارہ تقریباً پچاس سے زائد تعلیمی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی اداروں کا کامیابی کے ساتھ اہتمام کررہا ہے اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جسکا

قیام آزادئ ہند کے دوران ہوا، باقاعدگی سے اردو زبان و ادب کی تعلیم اور تحقیق کو اپنی نگرانی میں آگے بڑھانے کا کام کررہا ہے، تقریباً دس طالب علموں نے اردو میں جامعہ بمبئی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی ہے اور آج بھی تین چار طالب علموں نے اپنا نام ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے رجسٹر کررکھا ہے اب اس ادارے کے تحت اردو سے متعلقہ مضامین فارسی، عربی اور اسلامیات کو بھی بمبئی یونیورسٹی نے منظور کرلیا ہے ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر بمبئی یونیورسٹی کے اردو، فارسی و اسلامیات کے مقبول استاد ہیں اس ادارے کے زیر اہتمام نوائے ادب جیسا تحقیقی جریدہ بھی کوئی ۱۹۵۰ ء سے باقاعدہ شائع ہورہا ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر دنیا کے ہر ملک میں پہنچتا ہے۔ اسی طرح اس ادارے کے زیر اہتمام بزم تقریر و مجلس مذاکرہ وغیرہ کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے اور آج کا یہ پروگرام اس کی ایک کڑی ہے اور نامور مقالہ نگاروں میں پروفیسر یوسف سرمست (حیدر آباد) پروفیسر عبدالقوی دیسنوی (بھوپال) اور پروفیسر آدم شیخ (بمبئی) قابل ذکر ہیں جنہوں نے ہماری استدعا پر مجروح صاحب کی شخصیت، شاعری اور فن پر مقالے لکھے ہیں میں انجمن کی جانب سے معزز مقالہ نگاروں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں

اب میں انجمن اسلام اور اسکے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے محترم مجروح صاحب کی خدمت میں یہ "سپاس نامہ" اور "شال" پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں اور ساتھ ہی انکی بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھی نذرانۂ خلوص پیش کرتا ہوں اس ضمن میں یہ کہوں کہ ہمارے اساتذۂ کرام میں پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر صاحب جنہوں نے اپنی تدریسی زندگی کے پچاس سال سے زائد گذارے ہیں اور انسٹی ٹیوٹ سے بھی ان کا کوئی پچیس سال سے تعلق ہے میں انکی خدمت میں بھی "شال" پیش کرتا ہوں اور آخر میں مقالہ نگاروں کا پھولوں اور شالوں سے استقبال کرتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں آپ سب خواتین و حضرات کا بھی استقبال کرتا ہوں اور اب جناب مجروح صاحب سے دو لفظ کہنے کی درخواست کررہا ہوں۔

جوابی تقریر

(جناب اسرار حسن عروج سلطانپوری صاحب)

•

انجمن اسلام اور اس کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بمبئی) کے صدر محترم ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب اور دیگر منتظمین کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری پچاس سالہ اردو غزلگوئی کے میدان میں معاصرین سے مقابلہ کرتے ہی میں نہیں بلکہ معرکہ آرائی کرنے کے صلے میں آج جو میرے نام سے یک روزہ اردو سیمینار کا اہتمام کیا ہے اور (سیمینار طبق) اور (شال) سے مجھے نوازا ہے وہ دراصل انجمن کی وسعت نظری، ادب نوازی بلکہ اردو دوستی کی علامت ہے میں صدر صاحب اور تمام متعلقین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ میرا جسم دوبار ہوا ہے پہلا اثر پردیش میں تو دوسرا شہر بمبئی میں اور وہ بھی ترقی پسندی کے زیر سایہ شاعری کے سلسلے میں میری صحیح تربیت جگر مرادآبادی صاحب جیسے استادِ غزل اور ممتاز شاعر نے کی اور درحقیقت ان کی صحبت نے میری شاعری میں نئی روشنی کی روح پھونکی اور مجھے غزلگوئی کی طرف مائل کیا مگر میرا زیادہ وقت علیگڑھ میں رشید احمد صدیقی صاحب جیسے نامور ادیب، باکمال شاعر اور مستند استادِ اردو کے دولتخانہ پر گذرا سن انیس سو پچاس میں بمبئی آیا اور ترقی پسند تحریک کا ایک فعال رکن بن گیا میرے ساتھی اور میرے قریبی دوست مجھ سے ناراض ہی نہیں بلکہ خفا ہوگئے، تاہم میں نے انکو نہیں چھوڑا کیونکہ غزل سے مجھے جذباتی لگاؤ تھا حالانکہ اس وقت بھی میں ترقی پسند تحریک کا ایک باقاعدہ ممبر تھا غزل گوئی محض کوئی شاعری نہیں بلکہ دردِ دل کا اظہار ہے بقول ایک فارسی شاعر ع

در دلِ ما غم دنیا غم معشوق نو ست

اور میرا یہ واضح لگاؤ کسی ایک سے نہیں بلکہ سارے عالم سے تھا جیسا کہ میرے اس شعر کے ایک مصرع سے واضح ہوگا ع

سارے عالم میں بھر دیا عشق

یا اصغر گونڈوی صاحب جیسے مشہور غزلگو شاعر کے الفاظ میں ـــــہ

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

یہ کہنے میں مجھے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ایک طرف جگر مرادآبادی صاحب جیسے ممتاز غزلگو سے اصلاح لینے کے طفیل میں مجھے ان کا انداز شعر گوئی ملا تو دوسری طرف حسرت موہانی صاحب جیسے استاد شاعر کی صحبت سے میری غزلگوئی میں انکی جھلک بھی دکھائی دینے لگی ـــــہ

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

یا یوں کہیئے ـــــہ

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ، ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

اور اگر میں بشاشت سے کمیونسٹ بنا تو اس وجہ سے کہ اس وقت کے حالات اور ماحول نے مجبور کردیا تھا ـــــہ

ایسے نادان بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو! پند گرو! راہ گذر تو دیکھو

یا کہوں میں نے یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا ـــــہ

میری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو، مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

آخر میں کہونگا ـــــہ

سنگ تو کوئی بڑھکر اٹھاؤ، شاخ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو، ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

ایک مرتبہ اور میں محترم ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب اور محبی ڈاکٹر
گوریکر صاحب کا بالخصوص دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے
میرے اعزاز میں اس سیمینار کا انعقاد کیا ہے اور آپ سب
سامعین کا بھی مشکور ہوں ناانصافی ہوگی اگر میں
اپنے مہمان مقالہ نگاروں میں پروفیسر یوسف
سرمست (حیدر آباد)، پروفیسر عبد القوی
دسنوی (بھوپال) اور پروفیسر آدم
شیخ (بمبئی) کی خدمت میں
ہدیۂ تشکر پیش نہ
کروں

اب میں آپ
خواتین و حضرات کے
درمیان حائل ہونا نہیں چاہتا
اور مقالہ نگار حضرات سے استدعا
کرتا ہوں کہ وہ اپنے مقالے پیش کریں

شکریہ!

مجروح کی غزل
(حالی سے رد تعمیر تک)

از

پروفیسر یوسف سرمست، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد

اچھی تخلیق کی تحسین میں تنقیدی رجحان یا معیار کے بدلنے سے کوئی اہم فرق نہیں آتا یہ ہوسکتا ہے کہ وقتی طور پر اس فنکار کو وہ مقام نہ ملا ہو جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب تعصبات کی دھند چھٹنے لگتی ہے تو فنکار کا حقیقی درجہ متعین ہونے لگتا ہے اس کو وہ مقام حاصل ہوجاتا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس لیے کہ اچھی تخلیق ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر مجروح کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حالی سے رد تعمیر تک ان کی غزلگوئی ہر کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔

حالی کے 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اس میں حالی نے اردو غزل کی مخالفت کی ہے۔ حالی کے تعلق سے ایسا لکھنے والے یا سوچنے والے معلوم نہیں کیوں 'یادگارِ غالب' اور 'حیاتِ سعدی' کو فراموش کردیتے ہیں خاص طور پر 'یادگارِ غالب' کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ حالی اس صنف سخن کے قطعی مخالف نہیں تھے کیونکہ شاعری میں غالب کی عظمت کا تمام تر انحصار ان کی غزل گوئی پر ہے اس بات پر اصرار حق بجانب ہوگا کہ غالب کا معترف غزل کا منکر ہو ہی نہیں سکتا حالی نے غزل کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ اس کی اصلاح کی بڑی ہی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں

> 'ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقے پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں'۔

ان کی اصلاحی تجاویز اس قدر اہم، دور رس اور جامع تھیں کہ ان کے

بعد ہر اچھا اور بُرا غزل گو ان راستوں پر شعوری یا غیر شعوری طور چل کر ہی اپنا منفرد انداز یا مقام پیدا کرسکا ہے۔ خاص طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہم ترین غزل گو شاعر، حالی کے نظریات پر کاربند رہے ہیں۔ مجروح کی غزل گوئی کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو اس سے نہ صرف مجروح کی غزل گوئی کی اہمیت ظاہر ہوگی بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حالی نے مستقبل کے لئے غزل گوئی کے بارے میں کیا لائحہ عمل مرتب کیا تھا

یہاں یہ سوال کسی کے ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ حالی کے نظریات پر چلنے سے مجروح کی اہمیت کس طرح نمایاں ہوسکتی ہے؟ وہ اس طرح کہ حالی نے غزل کی اصلاح کے لیے تجاویز پیش کی تھیں۔ اس لیے ان پر عمل پیرا ہونے والوں نے گویا عملی طور پر غزل کی اصلاح کی ہے دوسرے یہ کہ حالی نے ایلیٹ سے بہت پہلے یہ بات بتائی ہے کہ روایت کو قائم رکھتے ہوئے بھی انفرادیت پیدا کی جاسکتی ہے اور حقیقی انفرادیت وہی ہے جو روایت کے وقوف کے بعد پیدا ہوتی ہے

حالی یہ جانتے تھے کہ غزل نے حد درجہ مقبول صنف سخن ہے۔ اس کے چٹخارے سے ہر شخص واقف ہے اردو کی صرف یہی صنف سخن ایسی ہے جس کی اصلاح تمام اصناف سخن پر مقدم ہے حالی نے آج سے سو سال پہلے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ

«زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی»۔

حالی نے «تنگنائے غزل» کو وسعت دینے پر زور دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہر قسم کے موضوعات، جذبات اور احساسات کو غزل میں جگہ دی جائے۔

مجروح نے بھی اپنی غزل میں ہر قسم کے موضوعات کو جگہہ دی ہے وہ تغزل کو قائم رکھتے ہوئے اپنی بات کہتے ہیں۔ یہی وجہہ ہے کہ ان کا «نغمہ» زمانے کے چلن تک محدود نہیں رہا بلکہ نوائے جاوداں بن گیا۔ اس لیے کہ اس

میں (روح ساعت) اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے:

ہوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

مجروح نے یوں غزل کی عمارت کی اپنے طور پر تعمیر و ترمیم کر کے اسے ڈھائے جانے سے بچایا ہے۔ حالی نے غزل میں عشق کی (چاشنی) کو ضروری قرار دیا ہے۔ مجروح نے جگہ جگہ اس چاشنی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ وہ غرض حال بطرز (نگاہ یار) کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہزاروں کی (نوا سنجی) میں بھی ان کی (کم سخنی) ایک ایسا (تماشا) بن جاتی ہے جس کی طرف سب متوجہ ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ مجروح کے کلام میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو صرف عشق کی (چاشنی) ہی نہیں رکھتیں بلکہ سر تا پا عشق کے جذبات سے سرشار ہیں جیسے اُن کی وہ معروف غزل۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمے میں آگئی
وہی لب نہ میں، جنھیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے، وہی آستیں
دل زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشم مست پتا بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم ہے
تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

اس غزل میں عشق کے معاملات اور کیفیات کا بیان، غزل کی روایت سے

انحراف نہ ہونے کے باوجود روایتی نہیں ہے۔ ہاتھ کا ہاتھ میں آجانے سے چراغوں کا روشن ہوجانا اور چراغوں کے جل جانے سے منزلوں کا سہل ہوجانا بڑی معنویت رکھتا ہے۔ لجا کر سر کو جھکا لینے کی تصویر حسن خوبصورتی سے پیش کی گئی ہے، اس کا جواب اردو غزل میں مشکل ہی سے ملے گا۔ اسی طرح زمانے کے طور بدلنے کا شدید احساس اور اس احساس کے نتیجے میں (دل زار) کو بدلنے کا خیال اور آخر میں کاوشوں اور گردشوں میں بھی یہ حوصلہ رکھنا کہ اس کی وجہ سے قدم کے خار نکل جائیں گے، ایسی باتیں ہیں جو اردو غزل کی عام روش سے الگ ہیں۔ عروج کے تغزل میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کے باوجود انفرادی شان ہر جگہ قائم رہتی ہے۔ جیسے ان اشعار میں

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر، اس کی کم نگاہی بھی

اس نظر کے اٹھنے میں، اُس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے، آہِ صبح گاہی بھی

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

دیکھا رنگ بدن یار کے پیراہن میں
چاندنی دودھ سی چھٹکی مرے آنگن میں

حیا کے ذکر پہ ہم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

اللہ رے وہ عالم رخصت کہ دیر تک
تکتا رہا ہوں یوں ہی تری رہ گزر کو میں

یہ کلاسیکی رنگ و آہنگ چونکہ فیض کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ اس لیے عام طور پر مخدوم کی غزل گوئی کا مقابلہ فیض سے کیا جاتا ہے محمد علی صدیقی نے دونوں کے فرق کو یوں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ۔

(مخدوم بڑی حد تک ترقی پسند رہتے ہوئے بھی (تغزل) کے حق میں جانب دار ہیں۔ جبکہ فیض اس قدر شعوری نہیں جس قدر کہ مخدوم، فیض اور مخدوم کے مابین یہی بنیادی فرق ہے جو خط فاصل کا درجہ رکھتا ہے)

مخدوم اور فیض دونوں ہی جب تغزل کو قائم رکھتے ہیں، خواہ وہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر تو پھر اس سے ان دونوں کی غزل گوئی کا فرق کس طرح سے نمایاں ہوسکتا ہے اس لیے اس کو خط فاصل کا درجہ دینا بھی غلط ہوگا. دوسری جگہ انھوں نے دونوں کی شاعری میں امتیاز پیدا کرنے کی یوں کوشش کی ہے ۔

(فیض کے شعر میں کہیں بھی (میں)، (مجھے) یا (میری) نہیں ہے جب کہ مخدوم کے یہاں (مجھے) کی تکرار اور (مری) کی تصور سے جس نوع کا (اصرار) ملتا ہے وہ فیض کے یہاں مفقود ہے۔ یہی فیض اور مخدوم کے لہجہ کا فرق ہے)

یہ بات بھی دونوں کی شاعری کے فرق کو نمایاں نہیں کرتی پہلی بات تو یہ ہے کہ محمد علی صدیقی کا یہ کہنا کہ فیض نے اپنے شعر میں کہیں بھی (میں) (مجھ) یا (مری) کے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں صحیح نہیں ہے ان کا بہت ہی مشہور و معروف شعر ہے

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

دوسری بات یہ کہ فیض نے اگر (مجھ) یا (مرا) یا (مری) کے الفاظ کم استعمال

کیے ہیں تو اس سے دونوں کی شاعری کا اہم فرق کس طرح نمایاں ہوسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک مجروح اور فیض کی غزل گوئی کا ایک فرق تو یہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن، عشق اور غیر کی اساس پر استوار ہوتی ہے مجروح کی شاعری میں ایسا کوئی مثلث نہیں بنتا وہ حسن و عشق کی بات غیر کے حوالے کے بغیر کہتے ہیں۔ مجروح کھل کے (غمِ دل) بیان کرتے ہیں جب کہ فیض اپنی بات (اشکوں) میں سناتے ہیں اور (آہوں) میں غزل خواں ہوتے ہیں

اس کے علاوہ مجروح اور فیض کی شاعری میں جو بنیادی فرق ہے اس کو شاید ابھی تک کسی نے نمایاں نہیں کیا ہے وہ یہ کہ فیض کی شاعری سر تا سر رومانیت میں ڈوبی ہوئی ہے جبکہ مجروح کی شاعری ٹھوس حقائق کے ادراک پر استوار ہوتی ہے یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ رومانیت بے حد وسیع اصطلاح ہے اردو میں عام طور پر رومانیت کا لفظ محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لیے رومانیت کہہ کر ہم کیا مراد لیتے ہیں، جب تک اس کی وضاحت نہ کریں اس وقت تک رومانیت کی اصطلاح استعمال کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ ایک فرانسیسی ادیب کے کہنے کے مطابق

Romanticism means so many things that it means nothing

حقیقت یہ ہے کہ رومانیت کے اتنے معنی ہیں کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں رہے ہیں بہرحال یہاں رومانیت سے میری مراد (جذباتی آرزومندی) ہے فیض کی پوری شاعری میں یہ جذباتی آرزو مندی چھائی نظر آتی ہے یہاں ان کے کلام سے چند ایک مصرعے پیش کیے جارہے ہیں جن سے ان کی رومانیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کافروں کی نماز ہوجائے
ہوسکے تو یوں بھی بسر کردے
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے
چمن کو سجانے کے دن آرہے ہیں
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام
سنتے تھے وہ آہستگی سنتے تھے سحر ہو گئی

فیض کا بہت ہی خوب صورت شعر ہے۔

اک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

لیکن اس شعر میں بھی رومانیت کا اثر موجود ہے اس کے برخلاف مجروح کا شعر ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس شعر میں رومانیت کا کوئی پرتو نہیں ہے۔ بلکہ لہجے کی وہ صلابت ملتی ہے جو فیض کی شاعری میں نہیں ملتی یہیں مجروح کا رنگ تغزل فیض سے ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن دونوں نے اپنے اپنے انداز میں اردو غزل کے مزاج اور اس کی روایات کو قائم رکھا ہے۔

مجروح نے اردو غزل کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اپنے "خون جگر" سے اس طرح زمزمہ سنجی کی ہے کہ ان کی انفرادیت مسلم ہو گئی ہے۔ انہوں نے بجا طور پر اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
زمزمہ سنج مرا خون جگر ہے کہ نہیں

حالی بھی روایت سے انحراف کرنے کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ ان کے کہنے کے مطابق اردو شاعری کو ترقی دینے اور اس کو "صفحۂ روزگار" پر قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ "غیر مانوس" الفاظ کم ہوتے جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان الفاظ کو "نامعلوم" طور پر بڑھایا جائے۔ اور الفاظ کے حقیقی معنوں پر ہی قناعت نہ کی جائے بلکہ ان کو کبھی حقیقی معنوں میں،

کبھی مجازی مضمون میں، کبھی استعارے اور کنائے کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرائے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مجروح نے بھی قدیم الفاظ کو نئے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی غزل میں کلاسیکی رنگ و آہنگ قائم رہا دوسری طرف ہر قسم کے خیالات نئے انداز میں پیش کیے جاسکے

مجروح نے سیاسی اور انقلابی خیالات کے بیان میں بھی تغزل کو قائم رکھا ہے اس لیے ان کی شاعری کا بنیادی استعارہ (دار و رسن) ہے۔ یا پھر اس کے تلازمات جیسے زنداں، مقتل، سلاسل، زنجیر، گرفتار، اسیر، اور صیاد کی رعایت سے چمن، گل، بہار، جنوں ان کی بہت کم غزلیں ایسی ہیں جن میں مذکورہ بالا استعارے نہ استعمال کیے گئے ہوں۔ ان کا (جنونِ دل) چونکہ اک (گل پیرہن) تک نہیں ہے اس لیے (قد و گیسو) سے ان کا سلسلہ (دار و رسن) تک ہے۔ مجروح کی غزل میں ان دیوانوں کی باتیں ملتی ہیں جو (سوئے مقتل) ایسے جاتے ہیں جیسے (پئے سیرِ چمن) کوئی جاتا ہے ایسے (اہلِ دل) جہاں بھی جاتے ہیں (جام بہ کف)، (سر بہ کفن) جاتے ہیں ان کی غـــزل گوئی کی یہ ایمائیت بڑی ہی فکر انگیز ہے جیسے ان اشعار میں ان کے محبوب استعارے کتنی گہری معنویت پیدا کرتے ہیں

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے
مگر اے ہم قفس، کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں، ایک دیوار کہن تک ہے
کہاں بچ کر چلی اے فصلِ گل، مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے

سوئے مقتل کہ پئے سیر چمن جاتے ہیں
اہل دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں

آگئی فصل جنوں کچھ تو کرو دیوانو
اب صحرا کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

لٹ گیا قافلۂ اہل جنـــوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تار رسن جاتے ہیں

روک سکتا ہمیں زنداں بلا کیا مجروح ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

آ ہی جائے گی سحر، مطلع امکاں تو کھلا نہ سہی باب قفس روزنِ زنداں تو کھلا
سیل رنگ آ ہی رہے گا مگر اے کشت چمن ضربِ موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

خندہ زن اس پہ ہے حلقہ زنجیر جنوں جو نہ کچھ حرمت سلسلہ داراں سمجھے

دیار جور میں رشتہ ہے اک یہی ورنہ کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے

اسیر بند زمانہ ہوں صاحبان چمن مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہئے

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

رخ تیغ سے جو نہ ہو کبھی، سحر ایسی کوئی نہیں مری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہِ زلف دار بسر نہ ہو

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کارواں سحر نہ ہو

کرو مجروح تب دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اس قامت کے سائے میں تمہیں جینے کا ڈھنگ آئے

ایسی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے یوں بہار آئی ہے تو کیا
ہے کیوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہوتا تھا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن، جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروح نے یوں نئے معنوں میں الفاظ اور استعارے استعمال کیے ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کی غزل میں بڑی معنوی تہہ داری پیدا ہوگئی ہے۔ ان کا یہ شعر:

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اس شعر میں بڑی معنوی وسعت ہے کیونکہ جب کبھی، جہاں کہیں اور جس کسی صورت میں بھی جبر و ستم ہوگا اس وقت عروج کا یہ شعر پڑھا جائے گا۔ اس میں انقلابی جد و جہد سے لے کر مخالف حالات میں ہر قسم کی جد و جہد کا مفہوم شامل ہے۔ (سیاہ رات) کا استعارہ ستون دار پر سروں کے چراغ کی وجہ سے جگمگا اٹھا ہے۔ اس غزل کے اکثر اشعار میں ہر قسم کی کوشش و کاوش کو یا ایسے حالات کو جہاں (ستم کی رات) چلتی ہے بڑی ہی ایمائیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

دیار شام نہیں منزل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی
وہیں پہونچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بپاس طرز نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے

بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے راہروں کے ہات چلے

عروج کی غزل کی اہم خصوصیت معنوی تہہ داری ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری ہر تنقیدی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ آج کل ایک جدید تر تنقیدی دبستان کا چرچا ہے جسے Deconstruction یا ردِ تعمیر یا پس ساختیات جیسے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں قاری کو مرکزی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کو قاری اساس تنقید بھی کہا جاتا ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ ہر

ادبی تخلیق کثیر معنویت رکھتی ہے۔ ہر قاری اپنی بساط کے مطابق اس سے معنویت اخذ کرتا ہے۔ اس تنقیدی نظریے میں کوئی نئی بات سوائے اس کے نہیں ہے کہ اس کو فلسفیانہ انداز میں منضبط کیا گیا ہے ورنہ اس پر عمل آوری ہر زمانے میں ہوتی ہے اور ہوتی آئی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب کی شاعری کی اتنی شرحیں نہیں لکھی جاتی تھیں اس تنقیدی نظریے میں البتہ یہ انتہاپسندی ملتی ہے کہ ہر متن کے تعلق سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کثیر معنی رکھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ اصل میں وہی تخلیقات کثیر المعنی ہوتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کی ہوں جن تخلیقات میں فن و فکر کی گہرائی ہوتی ہے وہی کثیر المعنی ہوسکتی ہیں اس بنا پر یہ نظریہ بھی صحیح ہوگا کہ ایسی تخلیقات جو کثیر المعنی ہیں وہی اعلیٰ درجے کی ہوسکتی ہیں یا یہ کہ صرف ان ہی تخلیقات پر ہر زمانے اور ہر قسم کا قاری غور و فکر کرتا ہے اور ان کی معنویت کا نئے سرے سے تعین کرتا ہے جو اعلیٰ درجے کی ہوں۔ مثال کے طور پر مجروح کا یہ شعر۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس شعر کی تشریح مذہب سے لے کر سیاست تک زندگی کے کسی بھی پہلو کو سامنے رکھ کر کی جاسکتی ہے دنیا کے عظیم ترین پیغمبر بھی وہ انسان جنھوں نے دنیا کو ایک نیا پیغام دیا تھا، خواہ وہ کسی میدان کے کیوں نہ ہو، اپنی منزل کی طرف اکیلے ہی چلے تھے۔ بعد میں ایک دنیا ان کے ساتھ ہوتی گئی لیکن شاعر نے یہ بات نہیں بتائی ہے کہ لوگ کیوں ساتھ ہوتے گئے لیکن بہت ہی بلیغ انداز میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ لوگ یوں ہی کسی کے ساتھ نہیں ہوجاتے۔ انھیں رفتہ رفتہ اس بات کا یقین ہوتا گیا کہ منزل تک پہنچانے والا صرف یہی شخص ہے۔ اس کا راستہ اچھا اور سچا ہے۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ ہوتے گئے۔ اسی طرح سیاست ہو یا سائنس یا فنون لطیفہ، ہر فکر و فن کے شعبے میں اکیلا آدمی ہی جانب منزل روانہ ہوتا ہے اور بعد میں کارواں بنتا جاتا ہے۔ کارواں کا لفظ بھی بڑی معنویت رکھتا ہے۔ لوگ کیوں کارواں کی صورت میں سفر

کرتے ہیں؟ اس لیے کہ کارواں تحفظ عطا کرتا ہے۔ طاقت اور قوت بخشتا ہے۔ اسی سے یکجہتی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ جو غم کو بانٹتا ہے خوشی کو دوبالا کرتا ہے بیگانگی کو دور کرتا ہے آرام اور سکون کو سہل الحصول بناتا ہے مجروح نے اس شعر میں فرد کا جماعت سے جو تعلق ہے، اسے بھی واضح کیا ہے اور جماعت، فرد کی جس طرح سے محتاج رہتی ہے اسے بھی نمایاں کیا ہے پھر یہ کہ اس شعر میں ایسی حسن کاری موجود ہے کہ مارکسی تنقید ہو یا تاریخی تنقید یا نفسیاتی تنقید یا اور کوئی دبستان تنقید وہ ہر معیار پر پورا اترتا ہے اسی طرح یہ پوری غزل اک معنوی گہرائی رکھتی ہے

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے آبلہ پایان شوق خار سے گل، گل سے گلستاں بنتا گیا

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

جیسا کہ انھوں اپنے مطلع میں کہا ہے کہ (غم) آرام جاں بنتا گیا سوال یہ ہے کہ غم کب آرام جاں بنتا ہے اس کا جواب خود شعر میں موجود ہے کہ جب کسی انسان کو (عرفان) حاصل ہوتا ہے ہر عظیم انسان کو یہ (عرفان) بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے کسی کو یہ عرفاں برگد کے پیڑ کے نیچے حاصل ہوتا ہے تو کسی کو پانی کے ٹب میں، اور جب یہ عرفاں حاصل ہوجاتا ہے تو اس وقت دل ہی دل میں (سوز جاناں)، (سوز دیگراں) بن جاتا ہے جب سوز جاناں سوز دیگراں بنتا ہے تو رفتہ رفتہ رسم چمن کی صورت منقلب ہونے لگتی ہے یوں دھیرے دھیرے (نغمۂ دل) بھی (فغاں) میں تبدیل ہوجاتا ہے ایسی (فغاں) جو (سوز دیگراں) سے پیدا ہوتی ہو صرف فغاں نہیں رہتی بلکہ بانگ جرس بن جاتی

ہے۔ اور جب بانگ درا رکھنے والا اکیلا ہی جانب منزل روانہ ہوتا ہے تو لوگ اس کے ساتھ آتے لگتے ہیں اور کارواں بن جاتا ہے اب (میر کارواں) کے لیے یہ بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ (پیر مغاں) بن جائے یوں تو سبھی کو سبھی (پیر مغاں) بن بیٹھتے ہیں۔ لیکن حقیقی معنوں میں وہی (پیر مغاں) ہوتا ہے جو (ساغر خاص و عام) بھر دے۔ اور ایسا پیر مغاں جس طرف بھی جائیگا (آبلہ پایاں شوق) اس کے ساتھ ہوں گے اور جب آبلہ پایاں شوق اس کے ساتھ ہوں گے تو پھر خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا جائے گا۔ اور جب یہ صورت حال ہوتی ہے تو 'شرح غم' مختصر ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے میں جو لفظ منہ سے بھی نہ نکلے وہ داستاں بن جاتا ہے۔ اور جب منہ سے نہ نکلنے والا لفظ بھی داستاں بن جاتا ہے تو شاعر میں وہ تخلیقی قوت پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس جہان فانی کا ہر وہ مضمون جسے شاعر چھو لیتا ہے وہ جاوداں بن جاتا ہے۔ اس طرح اس پوری غزل میں ایک اندرونی ربط اور معنوی تہہ داری ہے، اسی معنوی تہہ داری کی وجہ سے صرف یہ غزل ہی نہیں بلکہ مجروح کی پوری شاعری ہمارے لیے (مشعل جاں) ثابت ہوتی ہے ان کی شاعری کے تعلق سے ایک اور عمومی بات بھی کہہ دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہر اچھی اور بڑی شاعری بظاہر سلیس و سادہ ہونے کے باوجود معنوی گہرائی رکھتی ہے۔ وہ ایک عامی کو بھی متاثر کرتی ہے اور ایک عالم کو بھی اس کی تحسین دو مختلف سطحوں پر ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہ ظاہری خوب صورتی ہی نہیں رکھتی بلکہ باطنی حسن اورگہرائی بھی رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی اگر مجروح کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی بڑائی اور اہمیت ثابت ہوگی

• • •
• •
•

مجروح سلطانپوری کا شعری سفر اور ترقی پسند تحریک
(اعتراضات، رد عمل، شکایتیں)

از

پروفیسر عبدالقوی دسنوی، بھوپال-۱

اگرچہ مجروح سلطانپوری کے شعری سفر کی ابتدا سلطانپور سے ہوئی جہاں سے وہ حکیم بن کر اور روایتی غزل کا سرمایہ سمیٹ کر نکلے لیکن ان کی ذہنی تربیت ۱۹۴۲ع سے علی گڑھ میں شروع ہوئی جہاں تقریباً تین سال قیام رہا، پھر چھبیس سال کے نوجوان مجروح سلطانپوری، جگر مرادآبادی کے ساتھ، آج سے تقریباً نصف صدی قبل فروری ۱۹۴۵ع میں بمبئی پہنچے اور ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوگئے اور کمیونسٹ تحریک سے رشتہ جوڑ لیا، ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے راستے پر چل نکلی اور اسی کی ہو کر رہ گئی اس طرح علی گڑھ سے بمبئی کا یہ سفر مجروح سلطانپوری کی شاعری کے لئے غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا سفر بھی بن گیا

مجروح سلطانپوری خوش نصیب ہیں کہ اُن کی زندگی میں تین اہم شخصیتیں آئیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی، جگر مرادآبادی اور ہدایت کار کاردار پہلے دو نے ان کی ذہنی تربیت کی اس لئے انھیں وہ اپنا ذہنی استاد مانتے ہیں تیسرے نے انھیں فلمی دنیا میں گیت کار کی حیثیت سے متعارف کرایا جہاں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ پھر وہاں سے واپس نہیں لوٹے بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیا شعری دنیا کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور فلمی دنیا کی پکڑ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی اس طرح بمبئی نے مجروح سلطانپوری کو اشتراکی شاعر، فلمی گیت کار اور محترم و معتبر غزل گو بنا کر پیش کیا

مجروح سلطانپوری کے بمبئی کے شعری سفر کا اگر جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۵ع سے ۱۹۵۲ع تک کمیونسٹ تحریک نے انھیں اپنی گرفت میں کچھ اس طرح کرلیا تھا کہ ان کی شاعری میں کبھی کبھی گھن گرج پیدا ہونے لگی تھی اور وہ نعرے لگانے لگی تھی۔ ایسا کیوں ہوا یہ تو مجروح سلطانپوری

جاہیں مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں سارا قصور ان کی طبیعت کی سادگی اور جذباتی ہونے کا ہے ۔

اس تحریک سے وابستگی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجروح سلطانپوری نے ۱۹۴۹ع میں «مار لے ساتھی جانے نہ پائے» لکھنے کے جرم میں ایک سال تک قید و بند کی تکلیف دہ زندگی گوارا پسند کی، لیکن Sorry کہنے کے لئے تیار نہیں ہوئے

ان کی یہ قید و بند کی زندگی کیسی گزری اس سے عام طور سے لوگ واقف نہیں ہیں لیکن اس دوران میں انھوں نے کلام میر کا انتخاب کیا اور چند غزلیں ایسی ضرور کہیں جن کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے اس حصہ میں ان کے جذبات میں شدت اور ان کے سیاسی خیالات میں اور زیادہ پختگی آگئی تھی اور جس کی وجہ سے ان کی شاعری اور زیادہ نکھر گئی تھی اس زمانے کے چند اشعار یہ ہیں

جست کرتا ہوں تو اڑ جاتی ہے منزل سے نظر حائل راہ کوئی اور نہیں دیوار سہی
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغ ستم ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے
شب ظلم نرغہ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو
جنوں دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

ایک غزل جس کا مطلع ہے :

جس دم یہ سنا، ہے صبح وطن محبوس فضائے زنداں میں
جیسے کہ صبا، اے ہم قفسو، بیتاب ہم آئے زنداں میں

مکمل «زنداں نامہ» ہے اور ایک خاص کیفیت کی مظہر ہے ۔

قید و بند کی ایک سال سے زیادہ کی مدت میں انھوں نے صرف سات غزلیں کہیں

ہیں جنکے شعروں کی تعداد کل ۴۷ ہے ملاحظہ غزلوں اور شعروں کی یہ تعداد بہت کم ہے ممکن ہے کچھ غزلیں انتخاب میں نہ آسکی ہوں اور ضائع کردی گئی ہوں، مجموعی طور سے ان غزلوں میں اس دور کی سیاسی فضا کا ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے لیکن غزل کی فضا برقرار رہتی ہے اگرچہ شاعر کی کج کلاہی کی بھی ہر جگہ جلوہ گری نظر آتی ہے جو اُن کے ایک خاص موڈ کی طرف اشارہ کرتی ہے البتہ ان میں چند ایسے بھی شعر ہیں جو تغزل سے بھرپور ہیں اور کسی کی یاد دلاتے ہیں

اُن سے بچھڑے ہوئے مجروح زمانہ گذرا　　اب بھی ہونٹوں میں وہی گرمی رخسار سہو،
نہ اُجز کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں　　مہ تاباں کہ جو اس کا شریک انجمن تک ہے

رہائی کے بعد مجروح سلطانپوری اپنا شعری سفر کچھ اور ذہنی اور فکری جوش و خروش کے ساتھ طے کرنے لگے ان کے سیاسی نظریہ میں کچھ اور پختگی اور شدت آئی اور خود اعتمادی بڑھی اور انکی شاعری بھی کبھی کبھی سیاسی افکار سے بوجھل ہوکر ایک خاص جوش اور جذبے کے ساتھ گونجنے لگی تو جہاں اُن کی اس طرح کی شاعری کو سراہا جانے لگا وہاں مخالفت بھی ہونی شروع ہوئی اس طرح ممبئی کی زندگی میں ان کی شاعری کے خلاف دو طرح کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔

پہلی آواز ترقی پسندوں کے اس انتہا پسند گروہ کی تھی جو غزل کو ترقی پسند صنف ماننے سے نہ صرف انکار کررہا تھا بلکہ اس پر ان کی قہرآلود نگاہیں پڑرہی تھیں۔ وہ اس صنف کو لایق گردن زدنی قرار دے رہے تھے انھوں نے غزل اور مجروح سلطانپوری کی غزل گوئی کے خلاف طرح طرح کی آوازیں بلند کیں بہت ممکن تھا کہ مجروح سلطانپوری پست ہمت ہوجاتے اور غزل سے جو ان کی راہ و رسم قائم ہوئی تھی ختم ہوجاتی لیکن انھوں نے ایسا ہونے نہیں دیا اس کی وجہہ یہ تھی کہ یہ صنف انھیں بہت عزیز تھی چنانچہ انھوں نے ہر قسم کی مخالفت کا مقابلہ نہایت جرات مندی کے ساتھ کیا اور تمام اعتراضات کا جواب اپنی تیکھی،

تیر اور زندگی سے بھرپور غزلوں کے ذریعہ دیا۔ انھوں نے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ الفاظ، استعارے، تراکیب اور علامتوں میں اپنی چھاپ لگائی، لہجہ کو وقار، اعتماد اور یقین دیا اور کلام میں نازکی اور تاثیر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اور معترضوں کے ساتھ نے نیازی برتی اور اپنی کجکلاہی قائم رکھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن دھیرے دھیرے نغمہ دل بھی فغاں بنتا گیا ۳۲

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا ۳۳

یہ محفلِ اہلِ دل ہے یہاں، ہم سب میکش، ہم سب ساقی
۳۴ تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
۳۵ کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں، صحرا سے گلستاں دور نہیں

زمیں کو، مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار
۴۲ رخِ نگار سے روشن، چـــراغ بام کریں

یہ غزل سے گہرا تعلق ہی تھا کہ مجروح سلطانپوری نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کا نام (غزل) رکھا اور بعد میں اسے (مشعل جاں) بنا لیا۔ اور مخالفین غزل کو مخاطب کرکے صاف صاف کہا

(۔۔ میں ان صاحبان سے بھی مل چکا ہوں جـــو یہ فیصلہ سناتے سناتے بوڑھے ہوچلے ہیں کہ غـــزل اندھی ہے، لنگڑی ہے، گونگی ہے یہ علم کی شہزادیوں میں بار نہیں پاسکتی لیکن انھوں نے چار و ناچار یہ بھی ہمیشہ ہی دیکھا کہ غزل کے شعر کا جادو ان کی تحریروں و تقریروں میں ان کے سر چڑھ کر بولتا رہتا ہے آخر وہ کونسی کمی ہے جسے ایسے موقعوں پر دوسری اصناف سخن پورا نہیں کرسکتیں) (غزل مجروح سلطانپوری، ص ۶)

اور یہ فیصلہ سناتے ہیں

"(ان) شاعری میں اشاریت کا کمال ماورایت کی حد تک دیکھنا ہو تو
غزل کے علاوہ کہیں دوسری طرف نہ دیکھئے"

(غزل ۔ مجروح سلطانپوری، پانچواں ایڈیشن، ص ٦)

بلاشبہ ان کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد معترف ہونا پڑتا ہے کہ انھوں نے غزل کو جس طرح حقیقی زندگی اور اس کے مسائل سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے اسے سیاسی رمزیت سے روشناس کرایا ہے، وقت کے تقاضوں، حالات کی گرمی نرمی اور حادثات و واقعات کی سچائیوں سے سجا سنوار کر خوبصورت اور دلنشین زبان اور انداز میں پیش کیا ہے، اسے ایک خاص تیور، ایک خاص لہجہ اور ایک خاص سوز و گداز، ایک خاص وقار عطا کیا اور اپنے دور کی ذہنی اور فکری عکاسی اپنی غزلوں کے ذریعہ کچھ اس انداز سے کی کہ غزل چمک اُٹھی اور اپنے انداز و ادا اور اثر و تاثیر سے ایک دنیا کو اپنی طرف اور زیادہ متوجہ کرنے لگی جس کے نتیجہ میں اُن کے اور غـــزل کے مخالفین کی آوازیں کمزور پڑنے لگیں اور انصاف پسند لوگوں کو یہ کہنے میں تامل نہیں رہا کہ مجروح غزل ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور غزل ان کی اپنی صنف ہے۔ سچ ہے مجروح سلطانپوری محترم غزل گو بھی ہیں اور غزل کے منفرد طرفدار بھی ہیں۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ اس صدی کی پانچویں دہائی سے ان کے اشعار مختلف وقتوں میں مشاعروں کے ذریعہ اور کبھی کبھی اخبارات اور رسائل کے طفیل لوگوں تک پہونچے۔ زیر لب گنگنائے گئے اور فضاؤں میں گونجتے رہے، ذہنوں کو جھنجھوڑتے اور دلوں کو مضطرب کرتے رہے اور اپنی عظمت منواتے رہے۔ اُن کے اشعار نے ہمیشہ جینے کا حوصلہ اور کر گزرنے کی ہمت عطا کی اور اس طرح بار بار مجروح سلطانپوری کا مختلف انداز میں تعارف کراتے رہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں جو میرے خیالات کی تائید کرتے نظر آئیں گے۔

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا — میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

دستِ منعم میری محنت کا خریدار سہی — کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اس دوران میں مجروح سلطانپوری کے یہ اشعار بھی خاص طور سے نوجوانوں کے دلوں کو چھوتے رہے اور ایک خاص جادو جگاتے رہے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہی بات جو وہ نہ کہہ سکے، میرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

شب انتظار کی کشمکش نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی ایک چراغ بجھا دیا کبھی ایک چراغ جلا دیا

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ قدرت نے مجروح سلطانپوری کو خوبصورت آواز بھی دی ہے اس لئے جس محفل مشاعرہ اور ادبی نشست میں وہ پہونچتے رہے ہیں اپنی شاعری سے ساحری جگاتے رہے ہیں لیکن ترقی پسندی کے جوش میں جب ان کی شاعری سیاست کی آواز بنے لگی تو شاید پہلے نقاد رشید احمد صدیقی تھے جو مجروح سلطانپوری کو عزیز رکھتے تھے اور ان کی شاعری کو پسند کرتے تھے مگر پھر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیئے بغیر نہ رہ سکے

(۔۔۔ یوں، مجروح کی غزلیں بڑی دلآویز ہوتی ہیں اور ایک زمانے میں مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ آگے چل کر وہ غزل گویوں میں بڑا اونچا مقام پیدا کرینگے لیکن ترقی پسند حلقے میں پہنچ کر وہ غالب کے اس شعر کو فراموش کر گئے۔

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازہ گفتار نداند

(جدید شاعری · رشید احمد صدیقی بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک : خلیل الرحمن اعظمی، ص ۱۷۹)

قاضی عبدالغفار اپنی پسندیدگی کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ·

> ہندوستان کی نوجوان نسل کے آتش جانے سے جو چنگاریاں نکل رہی ہیں اُن میں سے ایک بہت روشن چنگاری مجروح سلطانپوری ہیں جنہوں نے تغزل کے وجدان میں اپنی بیتاب روح کو عریاں کیا ہے۔ ان کا شمار ان ترقی پسند شعراء میں ہے جو کم کہتے ہیں اور (شاید اس لئے) بہت اچھا کہتے ہیں۔ غزل کے میدان میں انہوں نے وہ سب کچھ کہا ہے جس کے لئے بعض ترقی پسند شعراء صرف نظم کا پیرایہ ضروری اور ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ،

(دیباچہ غزل، مجروح سلطانپوری نمبر، چراغ نمبر، ص ۳۹۳)

البتہ ۱۹۴۹ ع کے منشور کے بعد مجروح سلطانپوری کمیونسٹ تحریک سے اس قدر متاثر ہوگئے تھے کہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کو لکھنا پڑا :

> چنانچہ اس جوش وفاداری میں انہوں نے ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی جس کی یادگار ان کی دو غزلیں ہیں۔
>
> (۱) لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہوکے رہیگا
>
> (۲) یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے۔
>
> لیکن «عوامی تغزل» میں مجروح نے اپنے فن کی جمالیاتی قدروں کو جس طرح چھوڑ دیا تھا اس کی بنا پر اس کی سطحیت بہت جلد نمایاں ہوگئی۔ ،

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمن اعظمی، ص ۱۷۸)

اور سردار جعفری نے مجروح سلطانپوری کے اس طرح کے کلام کو سادہ، آسان اور نیچے معیار کا ادب ضرور قرار دیا لیکن پروفیسر رشید احمد صدیقی

کی طرح ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ان کا خیال تھا:

«ہندوستان جیسے پچھڑے اور ان پڑھ ملک میں اس قسم کے ادب کی بہت ضرورت ہے یہ ادب سے محروم لوگوں میں ادب کا ذوق پیدا کرتا ہے انھیں اور زیادہ بہتر ادب کی طرف راغب کرتا ہے ...»

(ترقی پسند ادب، سردار جعفری، ص ۲۵۸)

سردار جعفری کی اس رائے کے باوجود، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں میں سے کچھ کا رویہ مجروح سلطانپوری کے ساتھ اچھا نہ تھا جس کا علم ان کے مجموعہ کلام «غزل» کے «مطلع عرض کرنے سے پہلے» کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

«یہ اعتراف کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئیے کہ ہمارے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں وہ ایک امامانہ شان آگئی تھی کہ اُن میں سے بعض نے تو اپنے بارے میں یہاں تک طے کرلیا کہ جو اُن سے ملتا رہے، وہ ترقی پسند اور جو اُن سے ملنا ضروری نہ سمجھے اس کا کردار مشکوک گویا ترقی پسند تحریک خود ان کی ذات کا نام ہے»

اور یہ بھی اعتراف کرتے ہیں

«.. یہ اور اسی قسم کی افراط و تفریط، شعر و فن کے سلسلے میں بھی ہم سبھی سے ہوئیں یہ اور بات، کہ ہمارے تمام محاسن پر اُن سب غلطیوں کی سیاہی پھیری جاتی رہی»

[غزل مجروح سلطانپوری (پانچویں بار ستمبر ۱۹۷۰ ع) ص ۸]

اس دوران میں مجروح سلطانپوری کی بعض غزلوں پر کچھ حلقوں سے اس انداز سے اعتراضات ہوئے کہ وہ کبیدہ خاطر بھی ہوئے اور مضطرب بھی جس کا اظہار انہوں نے رفیع نیازی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس طرح کیا:

«البتہ میری غالبیت میں کافی لکھا گیا اور ترقی پسندی سے عداوت کا

سارا غبار میرے اُن اشعار کو نشانہ بنا کر نکالا گیا جو غزل میں ہیں اگرچہ اپنے مجموعہ میں تو شامل کر رکھا ہے مگر اپنی غزل کے نمائندہ اشعار نہیں سمجھتا۔ بلکہ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو غزل کے سانچے میں پوری طرح فٹ بھی نہیں ہوتے ۔

(مجروح سلطانپوری نمبر، چراغ بمبئی، ص ۴۱۶)

اور مثال کے طور پر مجروح سلطانپوری نے یہ اشعار پیش کیئے ہیں۔

آ نکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے
اب زمیں گائے گی ہل کے ساز پر نغمے وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

(مشعل جاں، ص ۵۵)

اے مُرد مال حرام، کمداؤں کی سرزمیں کرے گی زخم، کو دس ترے مکر وفن کے ساتھ
آنے دے باغ کے غدار میرا روز حساب مانگے تنکا نہ ملیگا یہی گلزار میں

یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آخری دونوں شعر غزل (۱۹۷۰ع) اور مشعل جاں میں شامل نہیں کیئے گئے ہیں

' مشعل جاں ' میں مجروح سلطانپوری کا رد عمل اور زیادہ تیز ہو جاتا ہے وہ لکھتے ہیں

' . . چنانچہ میری غزل کے بعض وہ اشعار جو نعرہ زنی کی حد میں آجاتے ہیں محدود نہیں گردانے گئے بلکہ میرے ساتھ ستم ہی یہ ہوا کہ میری پوری غزل کو انہیں بعض عیوب سے منسوب کر کے بڑے تو بڑے ' چھوٹ بھیئے ' بھی جو ہاتھ میں آیا لے لے کر میدان میں آگئے اور تب سے یہ سنگ باری آج تک جاری ہے ۔ میری خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف چند خامیوں کو معیار فن ٹھہرایا گیا ۔ . '

(مشعل جاں، ص ۱٦)

بلاشبہ مجروح سلطانپوری نے غزل پر اعتراضات کو نہ صرف برداشت کرلیا،

بلکہ نہایت جوش و ولولہ کے ساتھ غزلگوئی کرتے رہے اور اس کا جادو جگاتے رہے اور غزل کا معترف بناتے رہے اور «کامیابیاں» ، «داد و تحسین» آوازیں بلند کرتی رہیں لیکن مجروح سلطانپوری نے اپنے کلام پر جب اعتراضات سنے تو وہ برداشت نہ کرسکے اور اپنے مجموعہ کلام میں سے اُن اشعار کو حذف کرنے پر مجبور ہوگئے۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ حذف شدہ اشعار کا اگر کسی کی تحریر میں ذکر آجاتا تو مجروح سلطانپوری پر جھنجھلاہٹ کی کیفیت طاری ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کا اظہار بھی شدت کے ساتھ کرجاتے ہیں۔

مجروح سلطانپوری کو شکایت ہے کہ انھیں دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے اور کیا جارہا ہے۔ ان کی یہ شکایت اور بڑھ جاتی ہے جب ماہنامہ آجکل دہلی کے اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارے کے «گوشہ مجروح» میں پروفیسر وارث کرمانی یہ سوال اٹھاتے ہیں۔

«غالب کے بعد اگر اردو کی پوری عشقیہ شاعری کے صرف ایک ہزار شعروں کا انتخاب کیا جائے جس میں حالی، داغ، اقبال اور نہ جانے کتنے بلند اقبال شاعر نظر آجائیں گے تو اس انتخاب میں مجروح سلطانپوری کا کوئی شعر ضرور آجائیگا اور اگر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے تمام شاعروں کے کلام سے سو بہترین غزلیں منتخب کی جائیں تو اس میں مجروح کی کئی غزلیں آجائیں گی اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ اگر ایسے اشعار کو یکجا کیا جائے جو اس وقت باذوق لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں تو اُن میں مجروح کے شعروں کی تعداد اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہوگی۔ اگر متذکرہ بالا بیانات صحیح ہیں یا تقریباً صحیح ہیں تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ رسائل اور علمی ادبی حلقوں میں، نصاب تعلیم میں سیمیناروں اور تنقیدی مضامین میں مجروح کا ذکر کم ہوا ہے»۔

اور مجروح سلطانپوری نے اپنی شکایت کا اظہار «گوشہ مجروح» کے سلسلے میں

اپنے ان خطوط میں کیا ہے جو ماہنامہ آجکل دہلی کے اکتوبر ۱۹۹۳ ع کے «مجروح اور گوشہ مجروح» میں شائع ہوتے ہیں۔ انھوں نے ادارہ کے نام اپنے ۸ جولائی ۱۹۹۳ ع کے مکتوب میں تحریر کیا ہے:

«اس عطائے بے منت پر آپ سبھی پر حیران سا ہوا کہ اس عہد میں جبکہ مجھ پر کچھ لکھنے کے بجائے کچھ نہ لکھنے کا فیشن زیادہ ہے یہ کیسے ہوگیا»

اور ٦ مئی ۹۳ ع کو ڈاکٹر عبدالباری کو تحریر کرتے ہیں:

«ہندوستان اور پاکستان میں کئی ایسے ہیں جو مجھے کوئی خاص رتبہ دینے سے انکار کرتے ہیں مگر میں کسی کے سامنے یہ کہنے نہیں جاتا وہ بے چارے کچھ بھی فرمائیں مگر میں جانتا ہوں کہ میری انفرادیت کیا ہے مجھے ان کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے»

میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آئی کہ جس شاعر کے اشعار باذوق لوگوں کی زبان پر بہت زیادہ ہوں جس کا شمار اس دور کے اچھے شاعروں میں بہت پہلے سے کیا جارہا ہو، جسے اکادمیوں سے انعامات مل چکے ہوں اور جسے مدھیہ پردیش کا اقبال اعزاز دیا جاچکا ہے جس پر «چراغ» بمبئی کا بہت اچھا نمبر شائع ہوچکا ہے جس پر ماہنامہ آج کل کا گوشہ نکل چکا ہے اور جس کی شخصیت اور شاعری سے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی جگر مراد آبادی، پروفیسر آل احمد سرور قاضی عبدالغفار، سردار جعفری، معین احسن جذبی خلیل الرحمٰن اعظمی، ظ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، جگن ناتھ آزاد، شان الحق حقی، حسن نعیم، فضل جعفری، چودھری محمد نعیم، اصغر علی انجینیئر، ڈاکٹر عصمت جاوید، وامق جونپوری، یوسف ناظم ڈاکٹر اعجاز حسین، مجنوں گورکھپوری، پرکاش پنڈت، ڈاکٹر آدم شیخ وغیرہ بہت سے اہل قلم نے قلم اٹھایا اور مجروح سلطانپوری کی شاعری اور شخصیت سے متعلق اپنے اچھے خیالات کا اظہار کیا اور ان کے کلام پر تنقیدی اور توصیفی روشنی ڈالی، اس کے متعلق یہ فیصلہ کیونکر سنایا جاسکتا ہے کہ اُسے دانستہ یا معاصرانہ چشمک یا سازش کی وجہ سے نظر

انداز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے پروفیسر وارث کرمانی نے مجروح سلطانپوری کے ساتھ ناانصافیوں سے متعلق باتیں کر کے حق گوئی اور انصاف سے کام نہیں لیا ہے ستم یہ ہوا کہ مجروح سلطانپوری اس طرح کی باتوں سے متاثر ہوگئے۔ اُن کی زبان پر اس طرح کی شکایت کا آنا مناسب نہیں معلوم ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ادبی شخصیت کو علمی دنیا کے تعلق نے مجروح کیا ہے، اِدھر ان کا سارا وقت علم کے لئے مخصوط ہوگیا اُدھر اردو شاعری ان کی عنایات سے محروم ہوگئی جس کی وجہ سے شاعری میں مجروح سلطانپوری کا قد اور زیادہ بڑھ نہ سکا اور علمی مجروح سلطانپوری نمایاں ہوگئے اس کے ساتھ بعض نقادوں کے ہاتھوں ایک ستم اور ڈھایا جارہا ہے وہ فیض اور مجروح کی شاعری کا بار بار مقابلہ اور موازنہ کر کے حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک جیسا مسئلہ بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مجروح سلطانپوری نے نقادوں کے اس مقابلہ اور موازنے کے رویہ کا بھی اثر قبول کیا ہے چنانچہ نعیم صدیقی کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے فیض احمد فیض کا اسی انداز سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

(ہاں یہ صحیح ہے کہ میں (ترقی پسند غزل کی حیثیت سے) فیض کو غزل کی حد تک اپنے سے بڑا نہیں مانتا لیکن فیض میرے پیش رو ہیں جب میں نے تقلا کر شعر کہنے شروع کیئے تو اس وقت فیض کا مجموعہ کلام آچکا تھا لیکن میں ان سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ جہاں تک اُن کی شاعری اور فن کا سوال ہے تو وہ اپنی جگہ بہت خوبصورت ہے بڑا دلنشیں ہے اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی)

(مجروح سلطانپوری نمبر، چراغ نمبر، ص ۴۰۸)

اسی نمبر میں رفیع بیادی کے سوال (پھر آپ کا کہنا کہاں تک درست ہے کہ فیض آپ سے بڑے شاعر نہیں ہیں) کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

(لاحول ولا قوۃ) یہ میں نے کب کہا ارے فیض مجھ سے تو کیا

بہتوں سے بڑے شاعر ہیں۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے اور کہوں گا کہ ۴۵ ع سے ۵۲ ع تک ہندوستان میں فیض سے کوئی ترقی پسند غزل نہیں پہنچی تھی بلکہ شاید انھوں نے کہی بھی نہ ہو اس وقت میں تنہا شخص تھا جس نے یہاں پر غزل دشمنی کے دکھ سہے اس لئے غزل اور صرف غزل کی حد تک میں فیض کو پیش رو اور اپنے سے بڑا نہیں تسلیم کرتا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں غزل میں انھیں اپنے سے چھوٹا کہنے کی جرأت کررہا ہوں میں تو فیض، علی سردار جعفری، مجاز، جذبی، مخدوم ان سب کو اپنا پیش رو مانتا ہوں اس میں سے ایک نہیں ہے جس سے بڑا میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔" (مجروح سلطانپوری نمبر، چراغ بمبئی، ص ۳۱۴)

لیکن مجروح سلطانپوری کے دل میں ایک خلش فیض کے خلاف ضرور رہی وہ ۱۷ اگست ۱۹۹۲ ع کو ڈاکٹر عبدالباری کے نام خط میں یہ لکھے بغیر نہ رہ سکے

"... مزید اگر میں نے ایسے بھی اشعار کہے ہیں جو غزل میں ہوتے ہوئے بھی کسی طرح غزل کے نہیں کہے جاسکتے تو یہ ٹھوکریں میں نے اس لئے کھائیں کہ میرے سامنے ترقی پسند غزل کی کوئی روایت نہیں تھی جب کہ فیض کے سامنے میری خامیوں اور خوبیوں کا ورق موجود تھا سارا کھلا اس لیئے اور یہی ہوا کہ میرا مجموعہ فیض کے بعد شائع ہوسکا ویسے میں ہمیشہ فیض صاحب کو بردارانے کے طور پر اپنی غزلیں بھیجتا رہا آخر وہ مجاز، سردار جعفری، جذبی اور مخدوم کی طرح میرے پیش رو تھے اس وقت غزل کے نہ سہی ترقی پسند شاعری کے دوسرے اصناف میں سہی، اپنے بڑوں کا احترام میں نے ہمیشہ کیا ہے"

(مجروح اور گوشہ مجروح، آجکل دہلی، اکتوبر ۹۳ ع، ص ۴۷)

فیض سے متعلق مجروح سلطانپوری کی تحریروں اور سوالات کے جوابات

کے مطالعہ کے بعد جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱ مجروح سلطانپوری فیض کو غزل کی حد تک اپنے سے بڑا نہیں مانتے۔
۲ لیکن فیض کو اپنا پیشرو مانتے ہیں۔
۳ فیض سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔
۴ فیض کو اپنے سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔
۵ غزل کی حد تک فیض کو پیش رو اور اپنے سے بڑا تسلیم نہیں کرتے۔
۶ فیض کو اپنے سے چھوٹا بھی نہیں کہتے۔
۷ مجروح سلطانپوری اپنے سے بڑوں کا احترام ہمیشہ کرتے ہیں

تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ «یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔»

اس لئے کہ فیض خود کبھی اس طرح معاصرانہ چشمک کے شکار نہیں ہ اور مجروح سلطانپوری کو اپنے مختصر شعری سرمایہ کے باوجود، نمایاں ش اور مقبولیت حاصل ہوتی اور قدر و منزلت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ ا ٹھہریئے، اہل اردو کو، اپنے محترم شاعر مجروح سلطانپوری سے شکایتیں ہیں

مجروح سلطانپوری کے یک صنفی شاعر ہونے اور مختصر شعری سر ہونے کے باوجود اہل اردو کے درمیان ان کی مقبولیت اور محبوبیت میں کبھی ک کمی نہیں آئی حالانکہ فلمی دنیا سے متعلق ہونے کے بعد مجروح سلطانپو شعر و شاعری سے بے تعلق سے ہونے گئے جس کے نتیجے میں رسائل اور اخبار کے صفحات میں وہ کم نظر آنے لگے یہاں تک کے غائب ہوگئے، مشاعروں بھی کبھی کبھار ان کی مترنم آواز سنائی دینے لگی اور ادبی جلسوں اور کانفرنس سے بھی ان کا تعلق قریب قریب ختم سا ہوگیا۔ یہ درست ہے کہ مجروح سلطانپو کم گو رہے ہیں لیکن فلمی دنیا میں جانے سے قبل ان کی کم گوئی کبھی خاموش کی سرحدوں کو چھونے نہیں لگی تھی۔

دراصل خاموشی کی حد تک کم گوئی کی وجہ ان کی فلمی گیتوں سے گہر

وابستگی ہی ہے۔ جسے وہ مجبوری کہتے ہیں لیکن اُردو والے ایسا نہیں سمجھتے ہیں اس کی تاویلیں وہ کچھ بھی کریں اردو شاعری نہ تو مجروح کو معاف کریگی نہ فلمی دنیا کو فلمی دنیا نے مجروح سلطانپوری کو ہم سے چھین لیا اور مجروح سلطانپوری نے اچھی غزلوں سے ہم کو محروم کردیا اور اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ اپنے شعری سفر میں جو سرمایہ وہ لے کر چل رہے تھے اس کا ایک حصہ حذف کرنے کے نام پر راہ میں چھوڑ آئے چنانچہ جتنا حصہ ہم تک پہنچ سکا، وہ اور مختصر رہ گیا اس لئے اُن کے مطالعہ سے ادھورے مجروح سلطانپوری سے ہماری ملاقات ہوتی ہے مکمل تو جب ہی ہوگی، جب وہ مکمل شعری سرمایہ کو ساتھ لے کر چلیں گے اور ان پر تنقید کرنے والوں کو حقارت سے 'چھوٹ بھیّے' نہیں کہیں گے لیکن اس کے بعد یہ بھی سچ ہے کہ اس قلیل شعری سرمایہ کے باوجود انھوں نے اُردو غزل کو سربلند کیا ہے جس کے ہم دل سے معترف ہیں— اور رہیں گے

● ● ●

● ●

●

مجروح سلطان پوری

کی

غزل گوئی کے چند پہلو

از

ڈاکٹر آدم شیخ، سابق صدر شعبۂ اردو، برہانی کالج، بمبئی

شاعر کی گرہ میں انتہائی قلیل سرمایہ، پچیس سال کی مشقِ سخن کے بعد صرف چوالیس غزلیں اور انتیس متفرق اشعار، کل ملا کر ۳۲۴ شعر اور شہرت و مقبولیت کا یہ عالم کہ جگر اور جوش کے عہد میں صفِ اول میں براجمان اور اُن کے بعد سر فہرست معاصرین میں شمار، نہ کوئی گوشہ نشین اور نہ بعض نظم و سیاست میں گم۔ یہ ہیں مجروح سلطان پوری، دورِ جدید کے سب سے بڑے غزل گو، جگر مراد آبادی کے جانشین، رشید احمد صدیقی کے منظورِ نظر، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی اور معین احسن جذبی سے دادِ سخن پانے والے، خواص و عوام کے چہیتے، نقادوں اور محققوں کے معتوب، ملامتی عصبیت کا شکار اور معاصرین کے حریف۔ ان پر نہ کوئی قابلِ قدر تصنیف نظر آتی ہے اور نہ کوئی قابلِ ذکر مقالہ، حال حال ہی مثال ملے گی کسی ایسے صاحبِ قلم کی جسے اتنے تھوڑے سے کام پر، اتنی کم مدت میں، اتنی زبردست مقبولیت ملی ہو، ۴۵ع سے ۵۲ع تک پوری دہائی ہی ہوئی اور اشعار ضرب المثل بن گئے۔ جلسے، جلوس، انجمن ساز، اشتہار باز، انقلابی، اہلِ ایمان، بے ایمان، علمی حلقے، علمی دائرے سب اپنے اپنے طور پر مجروح کے مصرعے اور شعر دہرانے لگے، ان کا اپنا من بھاتا مطلب نکالنے لگے، یہاں تک کہ یہ شعر دور دور اڑ کر پہنچے تو اُن پر دوسروں کا نام پڑ گیا، مجروح کو یہ خداداد قبولِ خاطر نصیب ہوا اتنی سی عمر میں جب اُن کے بالوں میں سفید لکیر بھی نہیں پڑی تھی مگر تنقید کا قلم گنگ تھا یا مزید کا منتظر تھا۔۔ بس یہاں وہاں، اُن کا کوئی شعر حوالے میں یا ذکر ضمناً آجاتا تھا۔۔۔ یہ سازش نہیں تھی، کچھ اور کارن ہونگے۔[1] پھر ایک وجہ

---

۱ ظ انصاری

خود ظ انصاری ہی نے بتا دی کہ ۴۲ ع سے ۵۵ ع تک دس بارہ سال ترقی پسند ایمل کی ایسی ادبی تنقید لکھی گئی ہے جس میں سے اگر اسم معروفہ نکال لیا جائے تو کوئی کوئی پیریگراف تک پتہ ہی نہیں چلتا کہ لیس کے بارے میں ہے یا اسٹالین کے، کیفی اعظمی یا علام ربانی تاباں کی شاعری پر ہے یا طلوع آفتاب پر؟ اس کا ری ایکشن تو ہونا لازم تھا ہُوا، چھٹ بھیوں نے الھ کے، تنقید سمیت پورے ترقی پسند ادب پر فلم تسبیح پھیر دیا، چوٹی ہوئی، قلم پھیرتے وقت انھوں نے کچھ نام سالم چھوڑ دئے انھی میں احتر الایمان اور مجروح سلطانپوری کے نام تھے، مجروح کیسے سلامت رہ گئے؟[1] ترقی پسند اور پھر نئی تنقید کی کساد بازاری کی شکایت کرنے والے ڈاکٹر ظ انصاری بھی غزل کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، تیس چالیس سال تک غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کرتے رہے، غزلگو شعرا کی تن آسانی اور سہل پسندی کا رونا روتے رہے اور آخر کار غزل کی نمدادی کے قائل اور اس کی مقبولیت سے خائف نظر آتے گئے

اس صدی کی چوتھی دہائی میں چند بیدار فنکاروں نے یہ اعلان کیا کہ وہ یہ ثابت کرد کھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تعمیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہوتا ہے جو سماج کو بدلتا اور عروج کی راہ دکھاتا ہے، بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہے اور زندگی کے ارتقا کا علم بردار ہوتا ہے۔[2] ترقی پسندی کے بعد جدیدیت کا رجحان اُبھرا تو شعر و ادب میں ایک قابل ذکر تبدیلی آئی، انفرادیت نے اجتماعیت کی، روحانیت نے مادیت کی جگہ سنبھالی، ادب کا رشتہ سماج سے ٹوٹ گیا، فنکار بے چہرہ، شکست خوردہ اور تنہا رہ گئے، درد و کرب، غم و الم، انفرادیت، نفسیاتی الجھنیں ہی شاعری کا موضوع بن گئیں، اس طرح ترقی پسند، فکر و مقصد کا استعمال کرکے تجرید سے کلمات تک پہنچے اور جدیدیت کے علم برداروں کا وجدانی علم، انفرادیت کو وجود میں لے آیا، ان دونوں انتہاؤوں کی ادبی تنقید کی دنیا

۱ ظ انصاری

۲ خلیل الرحمان اعظمی

ں مجروح کی غزلیں زیادہ توجہ کے قابل نہیں سمجھی گئیں، اُن پر بہت کم لکھا گیا۔

تحریکوں اور رجحانوں، اپنوں اور بیگانوں کی نکتہ چینی اور سنگ باری ں زد پر رہنے کے باوجود مجروح کی غزلیں عوام و خواص میں مقبول ہیں اور رہیں گی۔

مجروح کی غزلوں کی یہ سخت جانی، اُن کے فکر و فن کی کامیابی کی دلیل ، بقول مجروح (میرا فن غزل ہی ہے، ترقی پسند غزل، اس کی واضح ابتدا میں نے ۱۹۴ع میں کی، جب سیاسی مضامین غزل والوں میں مقہور اور خود غزل ترقی پسندوں ، مردود قرار دی جاچکی تھی اس تنہائی اور بے بسی کے عالم میں بس ایک ن میرا رہبر تھا کہ غزل میں اپنے عہد کے کس موضوع کو کب خوبی سے بیان نہیں ا گیا جو آج نہیں بیان کیا جاسکتا)، اس طرح مجروح نے کلاسیکی تغزل کے ضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی غزلوں کو ترقی پسند افکار سے اس وقت آراستہ کیا ب خود ترقی پسندوں کی نظر میں غــــزل درخور اعتنا نہیں رہی تھی، جس کے سار بنائے جارہے تھے، ادب اور زندگی کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی شثیں کی جارہی تھیں، موضوعات میں مارکسی نظریۂ حیات، سرمایہ و محنت کی برش، طبقاتی نظام کی کشمکش اور استحصالی طاقتــــوں کے خلاف نبرد آزمائی ، روش ادب میں راہ پاچکی تھی)[1]

مجروح سے بے اعتنائی کے اسباب میں علاقائی عصبیت، معاصرانہ چشمک، ریکوں اور رجحانات میں گرفتار نقادوں اور مفکروں کے نظریات اور ارباب نظر ، سہل انگاری کے علاوہ یہ چیز بھی شامل تھی کہ مجروح وقت سے کافی آگے چل ے تھے، شاعری میں ایک ایسے نئے مسلک کی بنیاد رکھ رہے تھے جہاں ع کفِ جامِ شریعت، در کفِ سندانِ عشق، کا مشکل مرحلہ درپیش تھا، وہ نو غزل ، نقیب اور پیشرو بن گئے تھے اور غزلوں میں گہری معنویت اور اظہار و بیان خوبصورتی اور تہ داری کو برت رہے تھے جو ترقی پسندوں کی مقصدیت اور سی اشتہار بازی کے منافی اور موضوعات و روایات میں الجھی کلاسیکی غزلیہ شاعری

اختر سعید خان

کے لئے ناقابلِ قبول تھی، مجروح کی حالت بعینہٖ مصور ونسنٹ وانگاف کی طرح تھی جو اپنے دور میں بالکل سمجھا ہی نہیں گیا۔ اس کی کبھی ایک تصویر نہیں بکی، کیونکہ لوگ اسے سمجھ نہیں سکے کہ آخر وہ جانے خرافات کر کیا رہا تھا؟ اس کی تصویریں کن چیزوں کی بابت تھیں وہ بظاہر بے معنی اور لغو معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ ہمیشہ اپنی تصویروں میں پیڑوں کو اتنا بڑا اور لانبا بناتا تھا کہ اس کی شاخیں ستاروں سے آگے جاتی تھیں اور ستارے بہت ننھے ہوتے، سورج اور چاند چھوٹے ہوتے اور پیڑ شیطان کی آنت سے لانبے اور بڑے بڑے، کچھ لوگوں نے رنج ہو کر پوچھا، تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو، آخر کس نے ایسے ایسے پیڑ دیکھے ہیں؟ کچھ ہوش ٹھکانے ہے؟ کیوں تم اتنے بڑے پیڑ بناتے ہو جو سورج، چاند اور ستاروں سے ماورا ہو جاتے ہیں؟ وان گاف پہلے تو خوب ہنستا اور پھر بے اختیار درد مند لہجہ میں کہتا، میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں لیکن کچھ اور بھی جانتا ہوں، جس سے تم آگاہ نہیں ہو، یہ پیڑ، ستاروں سے آگے جانے کی دھرتی کی آرزو مندی کے ترجمان ہیں۔ میں آرزو مندی کی تصویر کشی کر رہا ہوں، پیڑوں کی نہیں، میں زیادہ سوتے سے جڑا ہوا ہوں، نصب العین سے نہیں، یہ قطعی طور سے غیر متعلق بات ہے کہ آیا وہ ستاروں تک پہنچتے ہیں یا نہیں، میں دھرتی سے جڑا ہوا ہوں، اس دھرتی کا حصہ ہوں، اس لئے میں دھرتی کی آرزو مندی کو سمجھتا ہوں۔ انسانی آرزو مندی کا یہ ارتقائی پہلو، مجروح کی غزل میں جلی یا خفی طور پر موجود ہے اور جس میں تخیل کی نزاکت و شادابی، فکر کی گہرائی و گیرائی، احساس کائنات کی پختگی اور معنویت نظر آتی ہے، اس لئے بیک وقت ہمارے وجدان کو بھی تشفی ہوتی ہے اور ہماری تہذیب کو جلا بھی ملتی ہے،

نقادوں اور محققوں کی چشم پوشی کا احساس مجروح کو بھی ہے۔ اپنے ہم مشرب اختر سعید خاں پر مضمون لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کا تذکرہ بڑی تلخی سے کیا ہے، لکھتے ہیں "ذات میں ہوں یا اختر یا دوسرے قابل ذکر رفقاء، سب کے مقابلے میں اہل قلم نے ہمیں قابل ذکر نہ جانتے ہوئے صرف فیض کی ذات سے غزل کو وابستہ کر دیا، چنانچہ آج ترقی پسند غزل کے ساز پر ایک ہی نام گونج رہا ہے، فیض کی غزلوں کے حسن تلے، اغلاط

وہاں کی بھرمار کے باوجود، انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ اب تو یہ ایک رویہ بن گیا ہے کہ ہمارے نقاد حضرات نے شاد، حسرت، فانی، جگر، یگانہ اور فراق کی غزل سے اڑان بھری تو چھپن سات سال کے ایام کو جن کے درمیان دو طرفہ پتھراؤ ہوا (غزل) (ترقی پسند غزل) کے نام سے وجود میں آئی اور پروان چڑھی، یہ حضرات ان تمام چھپن و سال کو اپنے پر پرواز کے پیچھے گرد کی طرح جھاڑتے ہوئے سیدھے فیض پر آکر ٹھہرنے لگے، جب یاروں کے زورِ پرواز کا یہ عالم ہو تو اس جھونک میں بیچارہ اختر، کیا نظر آئے۔ بلکہ آج کے ادیبوں میں عالمی طور پر کتنے ایسے ہوں گے جو یہ تک نہیں جانتے کہ اختر کا مجموعہ کلام (نگاہ) کے نام سے برسوں پہلے شائع ہوچکا ہے، غرض یہ کہ ان سخت جانوں کو قابلِ ذکر نہ سمجھنے کا رویہ عام ہوگیا ہے۔ ترقی پسند غزل کے طبقاتی شعور کے ساتھ وجود میں آنے والے اُس کے ارتقا اور چمن بندی کے وہ سخت اور مظلوم مگر کامیاب مہ و سال جن کا دامن (دسعت صبا) تک سے جاملا ہے، اُن کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے، تاریخِ غزل کا ایک اہم ترین ورق گویا زائد محض ہے اما بعد، خاکسار کو مجروح سے ان کے فکر و فن پر تبادلۂ خیالات کرنے کا کئی مواقع پر شرف حاصل رہا ہے، وہ دو لوک اس کا اظہار کرتے ہیں کہ علمائے ادب کی اس چشم پوشی کا ایک سبب اُن کی کم گوئی بھی ہے ملک زادہ منظور احمد نے اس کم گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"ادھر چند برسوں میں مجروح نے بہت کم غزلیں کہی ہیں اور وہ بہ قول خود (بر سرِ شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را) کے مصداق بن چکے ہیں کسی نے مجاز کے بارے میں کہا تھا کہ اردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑئیے اُٹھا کر لے گئے، یہ بات کہاں تک درست ہے فی الحال زیرِ بحث نہیں لیکن مجروح کے بارے میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جگر مرادآبادی کے تغزل اور سردار جعفری کے تفکر کا ایک عطر مجموعہ مجروح سلطانپوری کی غزلوں کی شکل میں سامنے آیا تھا، وہ فلم انڈسٹری میں اس بری طرح ضائع ہورہا ہے کہ نہ رونے ہی بن رہی ہے" یہ

> ہستے ہی بن رہی ہے۔ ایک ایسا ذہین اور باشعور شاعر جس کا سلسلہ قد و گیسو سے دار و رسن تک رہا ہو، جس نے صرف موسم، بندِ بہاراں، رقصِ ناتمام اور شرابِ خام جیسی نادر اور چونکا دینے والی ترکیبیں اردو شاعری کو عطا کی ہوں اور جو عمومی طور پر ترقی پسند تحریک کا سب سے اچھا شاعر رہا ہو، ان کی یہ جان لیوا کم گوئی، اس کے احباب اور چاہنے والوں پر بہت گراں گزر رہی ہے "

مجروح کی کم گوئی کی ایک توجیہہ معین احسن جذبی نے بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ "مجروح اپنی کم گوئی اور چھوٹی سی پونجی کے باوجود زندہ رہیں گے، انھیں ابتدا ہی میں جو شہرت نصیب ہوئی وہ دراصل ضرورت سے زیادہ تھی، وہ غالباً اس شہرت سے مطمئن ہوگئے، لیکن خدا کرے میرا یہ خیال غلط ہو اور مجھے انتہائی خوشی ہوگی اگر مجروح اسے اپنے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو اشعار کی تخلیق سے غلط ثابت کردیں۔"

مجروح نے ایک انٹرویو میں ملک زادہ منظور احمد کے خیال کی کسی قدر تائید کی ہے اور تردید بھی کہ "میری فلمی مصروفیت دو طرح سے حارج رہی، ایک تو گیت کاری کو کافی وقت دینا پڑا، دوسرے خود گیت کاری شاعری سے کسی قدر مانع ہے اس لئے جب شعر کہنے کی اُمنگ ہوئی اور اسی وقت کوئی گیت لکھنا پڑ گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُمنگ بھی گئی اور اس طرح میری کم گوئی اور بڑھ گئی" صنف غزل چونکہ گیت کی بنیادوں ہی پر استوار ہوئی ہے اور گیت سے اس لحاظ سے الگ ہے کہ وہاں محبت کا والہانہ اظہار ہوتا ہے اور غزل میں اظہار عشق اشاروں اور کنایوں میں کیا جاتا ہے کہ غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نہیں اس کا کمال گویائی نرینہ حرفی نہیں، (پیام زیر لبی ہے) اس لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ فلمی گیت کاری میں مجروح کی بھی تسکین ہوتی ہو اور وہ غزل گوئی کی جانب مائل نہ ہوتے ہوں

جذبی کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ مجروح کو نہ تو اُن کی شہرت نے تخلیقی عمل سے روکا اور نہ انھیں اس بات

کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ منزل پر پہنچ چکے ہیں، مجروح بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن اپنے شعری سفر کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک نے اُن کے فکر و فن پر گہرے اثرات مترتب کئے اور اُن کی غزلوں میں شعری جمالیات کے شانہ بہ شانہ حیات و کائنات کی تفسیریں اور منزل و مقصد کا تصور بھی در آیا، اُن کی غزل ایرانی اقدار کے حسن کی پاسدار ہے اور نئے تصورات کی خوبیوں کا خیر مقدم بھی کرتی ہے، ، مجروح نے قدیم و جدید کی آمیزش اور آویزش کے باوجود غزل کی روایتوں کو برقرار رکھا، ،[1] اسی بنا پر اُن کا ابتدائی کلام بھی بے حد مقبول ہوا اور بعد کی تخلیقات کی بھی بھرپور پذیرائی ہوئی، اس لئے یہ کہنا کہ شہرت نے انہیں کسی غلط فہمی کی بنا پر شعر کہنے سے باز رکھا، مناسب نہیں، البتہ مجروح نے ہمیشہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا اہتمام کیا کہ اُن کی تخلیقات بہر صورت حسین ہوں، خواہ وہ سجاد ظہیر کا نوحہ ہو، کشمیر کی دگرگوں حالت کا مرثیہ ہو، لتا منگیشکر کی سحر آمیز آواز کا اعتراف ہو، مقبول لوگوں کے ہاتھوں فنکاروں کا استحصال ہو یا کوئی غزل ہو۔ جمالیاتی عناصر سے مبرا نہ ہو۔

حسن کی یہی پاسداری، مجروح کی کم گوئی کا بنیادی سبب ہے، حالانکہ خود مجروح بھی اپنی کم گوئی کو دیاروں کی کم نگہی و سرد مہری کا رد عمل قرار دیتے ہیں، بقول مجروح ''میری پشت پر کوئی دست شفقت کبھی نہیں رہا، مجھے زندہ رکھا تو میرے غیر جانبدار سننے اور پڑھنے والوں نے، خواہ وہ کسی طبقے سے ہوں، میری غزل کو کسی صنف سخن سے کمتر نہیں جانا'' دراصل مجروح اُس فنکار کی طرح نہیں ہیں ''جو کسی مقصد کو سامنے رکھ کر ذہن سے تعمیری کام لیتا ہے تو اُس کی تخلیقات صحیح معنوں میں حسین نہیں ہوتیں کیونکہ جو تجربات اُن سے متعلق ہیں، وہ جمالیاتی نہیں بلکہ عملی اور افادی ہوتے ہیں، خاص مقاصد کو پیش نظر رکھنا اور ان کے حصول کے لئے مناسب ذرائع کا انتخاب گویا ایک پر تصنع عمل ہے، تخیلی پیکروں کا برجستہ ظہور بھی نہیں[2]''۔ بلند شاعری میں فن مقصد سے بے نیاز ہوتا ہے حتیٰ کہ مواد و معانی کے ارادی انتخاب کا بھی محتاج نہیں ہوتا۔ ایک شاعر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی تعمیری

---

۱ اختر سعید خان ۲ ولیم نائٹ

فنکار کس طرح ہر لمحہ تخلیق کرتا رہے۔ خیالات و جذبات کے انتخاب میں وہ بے بس ہوتا اور اظہار کے لئے اسے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ مجروح کے سلسلے میں یہ مدت انتظار خاصی طویل ہوجاتی ہے لیکن یہ ایک مجبوری ہے جس کا علاج مجروح بھی نہیں کرسکتے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فن بے صبری کی حالت میں صبر کی اعلیٰ درس گاہ ہے۔ بقول غالب ع

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مجروح کی کم گوئی کے تعلق سے عام طور ایک اور مغالطہ بھی عام ہے اور وہ یہ کہ فلمی دنیا کی نغمہ نگاری نے انہیں عدیم الفرصت بنا دیا ہے اور ایک آدھ جگہ خود مجروح بھی اس غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے کہ مجروح کی جوہر نواز اور جوہر شناس طبیعت، بسیار گوئی کے لئے کسی طور مناسب نہیں۔ وہ شعر کہتے نہیں، شعر ان پر نازل ہوجاتے ہیں۔ اقبال نے اسی رمز کو یوں کھولا ہے کہ ایک مثالی تخلیق میں مواد و ہیئت کوئی جداگانہ اشیا نہیں۔ ایک عمدہ شعر جذبے اور اس کا اظہار کرنے والے مناسب ترین الفاظ کے ساتھ فنکار کے ذہن پر نازل ہونے سے وجود میں آتا ہے۔ اس الہام و آمد کو شاعر نہ تو روک سکتا ہے اور نہ کسب کرسکتا ہے لہذا مجروح کی کم گوئی، ان کے ملال و مزاج کا نتیجہ نظر آتی ہے۔

مجروح کا شمار ترقی پسند شاعروں میں کیا جاتا ہے لیکن ان کے کلام سے کہیں بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں کہیں پر بھی سختی سے اس منشور، اعلان یا اصول و عقائد کی ترجمانی کی ہو جس پر اردو میں ترقی پسند ادب کی بنیادیں استوار ہوئی تھیں۔ پریم چند کے افکار، اختر حسین رائے پوری کے اعلانیے اور سجاد ظہیر کے تاثرات سے مجروح کے تصورات قدرے مختلف نظر آتے ہیں۔ اردو میں ترقی پسندی کی عمومی طور پر یہ وضاحت کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک رجحان تھا جس میں زندگی کی ترجمانی اور سماجی بصیرت کے نام پر اشتراکیت اور روس کی مدح سرائی ہوتی تھی اور جمالیاتی قدروں کو مقصدیت اور تشہیر پر ترجیح دی جانے لگی تھی، اسی بنا پر ترقی پسند تحریک ہمارے ادب میں مثبت اقدار سے بیگانہ ہوکر انتہا پسندی اور یکسانیت کا شکار ہوگئی،

انفرادیت کے بجائے اجتماعیت پر اور اخـــلاق و روحانیت کی جگہ پر مادیت کو فوقیت حاصل ہوگئی

۱۹۳۶ ع میں ترقی پسند ادبی تحریک کے پہلے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت کے ذریعے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک نئی روش سے روشناس کرایا تھا ، زندگی کے تعلـــق سے ادب کی نئی تفسیر و تعبیر پیش کی تھی اور کہا تھا ، (ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا ، ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ، آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا ، انہیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انہیں کی خوشیوں اور رنجوں ، حسرتوں اور تمناؤں ، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا ،) ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو ، آزادی کا جذبہ ہو ، حسن کا جوہر ہو ، تعمیر کی روح ہو ، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو ، جو ہم میں حرکت ، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے ، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی)

اردو ادب میں ترقـــی پسند تحریک کے مبلغ اختر حسین رائے پوری کا یہ اعلان تھا کہ (ثابت کردکھائیںگے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر اور تبدل کی کہانی ہے زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے ، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے ۔ اور جملہ نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے ، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا عَلم بردار ہوگا ،)

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی ایک اور قد آور شخصیت سید سجاد ظہیر اپنے ذہنی میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مـائل ہوتے جارہے ہیں ، ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجـــو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے ، ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے آفتیں اور مصیبتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی ، مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں ، جیسے جیسے

ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کرتے، تاریخی، سماجی، فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اسی سمت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔

اردو ادب میں ترقی، جدت اور سرتابی کا یہ رجحان اس لئے وجود میں آیا کہ اس صدی کی تیسری اور چوتھی دھائی کے فنکاروں نے کلاسیکی ادب کے موضوعات کو فرسودہ اور محدود پایا۔ لطف زبان اور زیب داستان پر معنی و مقصد کو قربان کرنے والی تحریریں اور شعر پڑھے، اور ادب کے پیشہ ورانہ پہلو کو نا پسند کیا۔ ترقی پسندوں کا یہ قافلہ زندگی کی راہوں پر گامزن ہونا چاہتا تھا، وہ ادب کو زندگی کا ایک شعبہ اور ماحول کا ترجمان تصور کرتے تھے اور ادب اور زندگی کے مقاصد میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ اسی گروہ میں مجروح بھی شامل ہوئے۔

مجروح ابتدا میں جن شعراء سے متاثر تھے وہ چونکہ سب کے سب ترقی پسند تھے اس لئے غیر شعوری طور پر اس تحریک سے وابستہ ہوگئے، ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں داخل ہونے کے بعد جب انھوں نے چند مخصوص کتابیں پڑھیں تو ذہنی اور شعوری طور پر بھی متاثر ہوئے بعد میں مجروح نے اپنے مختلف انٹرویوز اور تاثرات میں ادب کی ترقی پسندی کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا اُن کی روشنی میں جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں، انھیں خود شاعر کے الفاظ میں اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

"ترقی پسندی کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر انسان مظلوم ہے، تو اس کی حمایت کی جائے، اسے میں قطعاً غلط سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندی کو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ کیا جائے، اب ترقی پسندی کو جو لوگ تحریک کہتے ہیں، اُن سے میں کہتا ہوں کہ (تحریک) تو جب تھی، اب تو ایک رویہ ہے، یہ رویہ آج بھی قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گا۔ آپ اپنی گفتگو کا Diction بدل سکتے ہیں، استعارے بدل سکتے ہیں، کہنے کے طریقے بدل سکتے ہیں لیکن کون یہ نہیں چاہے گا کہ وہ زندگی کی دوڑ میں پیش رفت کرے خارجی طور پر کسی پارٹی بندی کی شکل میں کسی ادب کا تحریک بننا اس کی موت ہے۔ یہ اس کے لئے اچھا نہیں ہے وہ Narrow ہوجاتا ہے، اس میں یکسانیت آجاتی ہے، تنگ

نظری آجاتی ہے، روکھاپن آجاتا ہے، سطحیت آجاتی ہے، چنانچہ ہمارے ترقی پسند ادب کو اگر چھانا پھٹکا جائے تو اس کا آدھے سے زیادہ مواد سطحی اور خشک و بے جان نظر آئے گا (ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے اعلان کے بعد اس سوال کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ کوئی یہ پوچھے کہ میرا نظریہ شاعری کیا ہے میرے نزدیک اچھی شاعری اس کو کہتے ہیں جو شعوری، جذباتی اور جمالیاتی طور پر، انسان کو بہتر انسان بنانے میں مدد دے، ظالم سے اختلاف اور مظلوم کی حمایت کرے، اگر شاعر کسی ذاتی غم و مسرت کا اظہار کرے تو اس میں "میں" کا لفظ یا ضمیر اسی کی ذات تک محدود نہ ہو بلکہ اس میں اتنی تعمیم ہو کہ علامت بن جائے کہ جو بھی چاہے اُسے اپنے وسیلے سے دوہرا سکے۔»

ہمارا جدید شاعر تو روایات سے انحراف کا قائل ہے جس کے معنی اختلاف نہیں بلکہ انکار کے ہیں، روایات سے انحراف، معاف کیجئے گا، اپنے آبا و اجداد سے انکار کے مترادف ہے، حق سے انکار تو صرف ابو جہل کی تقلید کرسکتا ہے، میرے خیال میں ہمارے جدید شاعر انحراف کے لفظ کو اختلاف سے بدل لیں، تو اس کے نتائج بڑے دور رس ہونگے، یہ انحراف ہی کا نتیجہ ہے کہ جدید شعراء مشرق سے کٹ کر مغرب سے اپنا رشتہ جوڑنے پر مصر ہیں۔)

(میں اس میلان سے قطعی متاثر نہیں ہوں جو ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز میں کلاسیکی سرمائے کو نظر انداز کرنے کے لئے جوش و خروش سے سامنے آیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو پھر غزل کیسے کہہ سکتا تھا جو لوگ اس میلان سے متاثر تھے، ان کی بنیاد خود کلاسیکی سرمائے پر استوار تھی، مثلاً مجاز، جوش وغیرہ۔)

(غزل نئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں، یہ سوال جیسے غزل کا مقدر بن گیا ہے (تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ سوال، کسی نہ کسی کونے سے اٹھ ہی جاتا ہے، ۱۹۳۶ع کے بعد ۴۶-۱۹۴۷ع میں ترقی پسند مصنفین کی جانب سے بھی سوال دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ اٹھا تو اس وقت میں ۶-۷، سال کا نیا نیا شاعر ایک غزل گو کی حیثیت سے اس انجمن میں شریک ہوا تھا، اس وقت فیض کی سیاسی یا نیم سیاسی غزلیں سامنے نہیں آئی تھیں یا غالباً لکھی ہی نہیں گئی

نہیں چنانچہ میں ادب و زندگی کے حامی کی حیثیت سے غزل پر اپنا ایقان رکھتے ہوئے اکیلا دھکے کھاتا اور غزلیں کہتا رہا جب ۵۰ ع کے آخر میں ایک سال کی قید جھیل کر چند ہی غزلوں کے ساتھ باہر آیا تو اُن غزلوں کو سن کر کئی دوستوں کو اپنی غزل دشمنی کی آواز مدھم کردی پڑی اور بعضوں نے جو اتنے انتہا پسند نہیں تھے، غزل سے مایوسی کا از سرِ نو جائزہ لیا۔) ترقی پسند تحریک کا ابتدائی دور، وہ زمانہ تھا جب غزل کے خلاف ہر طرف سے حملے شروع ہوگئے تھے، الزام یہ تھا کہ غزل زندگی کے جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی، مگر میں نے میر، غالب کی روایات اور حسرت موہانی اور معین احسن جذبی کے اشارات کی روشنی میں، سیاسی اور سماجی مضامین کو غزل بنا کر پیش کرنا شروع کیا۔

ترقی پسند تحریک کا اہم مقصد حصول آزادی کی جد و جہد کو قلمی سہارا دینا تھا آزادی کے بعد ایسا کوئی نمایاں نصب العین چونکہ ترقی پسند فنکاروں کے سامنے نہیں تھا لہذا بعض نے تحریک سے علاحدگی حاصل کرلی اور بعض سوشلزم کے پرچار میں مصروف ہوگئے۔ فیض اور مجروح نے اپنے اپنے ملکوں کی قومی سرکاروں کی کوتاہیوں اور بے راہ رویوں پر سخت نکتہ چینی کی اور ایک نئی سرخ صبح کا انتظار کرنے لگے۔ اس کی پاداش میں دونوں کو قید و بند کی صعوبتیں بھی سہنی پڑیں۔ ۱۹۴۹ ع کی کل ہند مصنفین کانفرنس کے بعد تو ترقی پسندوں کے مقاصد اور سمت و رفتار میں اس قدر اختلافات رونما ہوئے کہ فیض، جذبی، خواجہ احمد عباس اور مجروح کی تخلیقات کو دقیانوسی بتایا جانے لگا اور ایک گروہ نے ترقی پسند تحریک کی سیاسی پابندی، مادی نقطۂ نظر اور بے جان مقصدیت سے عاجز آکر ادب میں ایک نئے رجحان، جدیدیت کی بنیاد ڈالی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کے ان مختلف پہلوؤں کے تناظر میں مجروح کے کلام کا فکری و فنی جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دیگر ترقی پسند فنکاروں کے مقابلے میں مجروح نے ادبی ترقی پسندی کی اُن بنیادی قدروں کی زیادہ پاسداری کی ہے جن کا تذکرہ ادب جدید کے پیغمبر میکسم گورکی نے کیا ہے کہ "ادب انسانیت کا نقاد ہے" اور اس کی کجروی کو ظاہر کرتا ہے، اس کی

جامکاریوں کو بے نقاب کرتا ہے ۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو قائم و دائم بنائے ، ادب کی بے کیفی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں ، وہ آدمـــی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اُسے جس روش پر چاہے لے جاسکتا ہے ، اس لحاظ سے ادب تعمیر پسند ، قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے ۔ ،

ترقی پسند مصنفین کے گروہ میں شامل ہونے کے فوراً بعد مجروح نے بھی ، انتہا پسندی کا شکار ہوکـــر بعض ایسے اشعار کہے جن سے اُن کی ترقی پسندی صرف اشتراکیت پسندی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی ، یہ اسی قسم کی شدت پسندی تھی جو ہر تحریک کی ابتدا میں اس کے ماننے والوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے ، ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب مجروح کے شعری سفر میں پختگی ، ٹھہراؤ اور احساس کی گہرائی کی منزل آئی تو خود شاعر نے ایسے اس قسم کے اشعار کو محمود نہیں گردانا ، مجروح نے اپنے مجموعہ کلام (مشعل جاں) کے دیباچے میں خود بھی اس کوتاہی کا ذکر کیا ہے ۔ دمیری غزل کے بعض وہ اشعار جو نعرہ زنی کی حد میں آجاتے ہیں ، محمود نہیں گردانے گئے بلکہ میرے ساتھ ستم ہی یہ ہوا کہ میری پوری غزل کو انھیں بعض عیوب سے منسوب کرکے بڑے تو بڑے ، چھوٹ بھیئے بھی جو ہاتھ میں آیا ، لے لے کے میدان میں آگئے اور تب سے یہ سنگ باری آج تک جاری ہے ، ، درج ذیل اشعار اسی قبیل کے ہیں ـــہ

امن کے پیغام کی جے ہو ، اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہوکے رہے گا

●

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمین ستارے جسے سلام کریں

●

اب زمیں اگائے گی ہل کے سار پر نغمے
وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے

مچلنے میں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانوں سے

•

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہو نہ سکے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا وطن سرخ ترا

•

مجروح کے کلام میں اس قسم کے اشعار بے حد قلیل ہیں اور ابتدا میں نقادوں اور محققوں نے اُن کی جانب توجہ بھی نہیں کی لیکن بعــــد میں جب مجروح کو مقبولیت حاصل ہوئی لگی تو بعض مقالہ نگاروں نے اِن اشعار کو بنیاد بنا کر اُن پر سخت حملے کئے۔ ایک صاحب نے لکھا "اشتراکیت انسانی تاریخ کے عظیم ترین انقلابات میں سے ہے۔ اس فلسفۂ زندگی نے عوام کا نہ صرف احترام کرنا سکھایا ہے بلکہ اُن سے محبت کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ لیکن دوسری تمام محبتوں کی طرح اگر عوام سے محبت بھی اعتدال سے گزر جائے تو نہ صرف چیزوں کی قــــدر و قیمت میں فـــــرق آجاتا ہے بلکہ بہت سے مضحکـــــہ خیز تصورات ذہنوں میں راہ پانے لگے ہیں، زمین نے ہل کے ساز پر نغمے کب نہیں گائے لیکن اِن نغموں سے انسان کا ذوق موسیقی کب آسودہ ہوسکا ہے؟ . . . اناج کے پیدا کرنے والے کسان اور مزدور ہیں، لہذا تمام حسینان جہاں کی زلفوں کو انہیں کے شانوں پر پریشان ہونا چاہئے کسانوں اور مزدوروں کی محرومیاں ہزار سہی، انہیں محبت کرنے سے کب روکا گیا۔ کیا تاریخ کے بدترین دور میں بھی ان کے شانوں پر زلفیں پریشان نہیں ہوتی رہیں؟ کیا کسانوں اور مزدوروں میں حسن بھی اسی طرح تقسیم کردیا جائے جس طرح پیداوار تقسیم کی جاتی ہے؟[1] ایک دوسرے شاعر نقاد نے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ، ترقی پسند ادیبوں نے دو طرح کا ادب پیدا کیا ہے۔ ایک وہ ادب جو بہت سادہ اور آسان ہے، اس لئے عوام کی سمجھ میں آجاتا ہے . . دوسرا ادب وہ ہے جـــو اعلیٰ درجے کا ہے، وہ عوام کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔ اس ادب کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ معیار بلند کرتا ہے۔ ادب کی ان دونوں قسموں کی تخلیق کرنے والے ترقی پسند

---

۱ نظـــیر صدیقی

ادیب ہیں میں ان دونوں قسموں کی مثالیں مجروح سلطانپوری کی شاعری سے کروں گا [1] اس بحث کی آخری کڑی مجروح کے یہ الفاظ ہوسکتے ہیں کہ "میری مخالفت میں کافی لکھا گیا اور ترقی پسندی سے عداوت کا سارا بخار، میرے ان اشعار کو نشانہ بنا کر نکالا گیا جنھیں اگرچہ میں نے اپنے مجموعہ میں تو شامل کرر کھا ہے مگر اپنی غزل کے نمائندہ اشعار نہیں سمجھتا بلکہ اُن میں بعض تو ایسے ہیں جو غزل کے سانچے میں فٹ ہی نہیں ہوتے۔"

مجروح کے ترقی پسند تحریک سے تعلق اور اُن کے کلام کی ترقی پسندی پر اس تفصیلی بحث کے بعد اب یہ دیکھنا چاہئے کہ عملی طور پر انہوں نے ترقی پسندی کا کیا مفہوم پیش کیا ہے۔

پستی زمیں سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کجکلاہی بھی

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہے دنیا، کفر ہے کہ ایماں ہے

اپنی اپنی ہمت ہے، اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بھی ارزاں ہے، موت بھی فراواں ہے

مرے عہد میں نہیں ہیں یہ نشان سربلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن، جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

---

۱ سردار جعفری

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا جاوداں بنتا گیا

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے، اتنا تو کوئی مجبور نہیں

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آتی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلانِ بہاراں ہوتا تھا

فریبِ ساقیٔ محفل نہ پوچھئے مجروح
شراب ایک ہے، بدلے ہوئے ہیں پیمانے

ہیں اس کشاکشِ پیہم میں زندگی کے مزے
پھر ایک بار کوئی عشق ناتمام کریں

ہم قفس صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آہی گیا

اہلِ تقدیر! یہ ہے معجزۂ دستِ عمل
جو خزف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ نہیں

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کی چلن تک ہے

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے، صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈتے ہیں دیوار کے سائے زنداں میں

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے یہ بھی وحیٔ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
اور کچھ روز میں رسوا سر بازار سہی

جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

مجروح کے ان چیدہ اشعار کی روشنی میں یہ بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جمالیاتی قدروں، معنوی گہرائیوں اور غزل کی دوسری امتیازی خصوصیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ترقی پسند غزل سے یہ واضح کردیا ہے کہ اس میں زمانے کی ہر نئی کروٹ اور سماج کی ہر دھڑکن کو خوبصورتی کے ساتھ ایک مخصوص لب و لہجے میں بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ بت پرستی کی ایک صورت بھی ہے اور بت شکنی کا ایک عمل بھی، جزو کا محرک بھی ہے اور کل کا تھپک کر سلا دینے والا ہاتھ بھی، تجرید بھی ہے جو غزل کی بنیاد ہے اور تفصیل بھی جس کا تقاضہ نظم کرتی ہے، خود بینی کی کیفیت بھی ہے اور جگ بیتی

کا انداز بھی، فرد کا تجربہ بھی ہے، اجتماعی لاشعور بھی، غزل اشاروں کنایوں اور رمز و ایمائیت کے سہارے معاشرے کے مسائل کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ شکست و مایوسی کے ظلمات میں روشنی کی کرن بن سکتی ہے، زمین و آسمان کی قوتوں کو تسخیر کرنے پر انسان کو راغب بھی کر سکتی ہے، علم، اخلاق، معاشرت، تمدن، عمرانیات اور اقتصادیات جیسے موضوعات اور قدروں کی تفسیر بن سکتی ہے، خارجی حسیات اور جبلی میلانات کی امتزاجی صورت بن سکتی ہے، زندگی کی نامیاتی اور جدلیاتی توانائیوں کو انقلابی تصورات میں ڈھال سکتی ہے، قنوطیت شکن اور رجائیت افروز بن سکتی ہے، فکر و عمل کی ترجمان اور افراد و جماعت دونوں کے لئے خیر و برکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجروح نے اپنی غزلوں کے توسط سے اُن ترقی پسند قدروں کا استعمال اور تحفظ کیا جو پریم چند کے الفاظ میں وہ تھیں جن میں تفکر، جذبۂ حریت، جوہر حسن، تعمیر کی روح، زندگی کی حقیقت، جہد و حرکت اور بے چینی ہو۔

مجروح بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں جہاں دروں بینی اور داخلیت، آہنگ اور ترنم بنیادی عناصر ہوتے ہیں لیکن انھوں نے ان غزلوں میں نہ تو معنوی پہلو کو حاوی ہونے دیا اور نہ صوری کیفیتوں کو ترجیح دی، بلکہ افکار و تصورات کا ایک ایسا توازن قائم کیا جس میں فکر کی بدولت تخیل کو وسعت و بلندی حاصل ہوتی ہے اور تصورات کی بنا پر افکار کو حسین پیکر۔ اسی توازن و امتزاج کی بدولت مجروح کی غزل میں وہ آہنگ پیدا ہوا جس کی جڑیں اُن کی شخصیت اور ان کے ماحول و معاشرے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ مجروح، فکر و جذبہ کے نازک اور لطیف پہلوؤں کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ فنکار اور قاری کی روح کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔ اسی سے ان کی غزلوں میں لطافت و نفاست کی ایک فضا قائم ہوتی ہے۔ مجروح جب یہ کہتے ہیں کہ "غزل میرا فن ہے اور ترقی پسند غزل اس کی واضح ابتدا" تو اس کا صریح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ شاعر نے قدیم و جدید شعری روایتوں کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ تغزل اور غنائیت، مجروح نہ ہو سکے

مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
مری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

مجروح نے ذاتی حسیات اور جمالیاتی تجربات کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ شخصی تصورات عمومی رنگ اختیار کرجاتے ہیں اور فرد کے تجربے کے ہمہ گیر اور اجتماعی پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ۔ شعور ذات میں شعور کائنات شامل ہوجاتا ہے ۔ مجروح نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنی غزل گوئی میں جن مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا اور جن موضوعات کو اہمیت دی تھی غزل کے فکری و فنی تقاضوں کو نظر انداز کئے بغیر، اُن کی خوبصورت اور دیانتدارانہ ترسیل، ایک انتہائی مشکل امر تھا، اس لئے کہ ترجمانی کا بھونڈا پن تجربات کے حسن کو زک پہنچاتا ہے اور وہ عملی و افادی لگتے ہیں، مجروح اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مرحلے سے سرخرو گزرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں منطقی نکات، جمالیاتی صداقتوں سے اس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ اُن کی تقسیم ناممکن ہوجاتی ہے ۔ فن میں خون جگر کی نمود کے لئے مجروح کو نجانے شعور و لاشعور اور اظہار و اسالیب کی دشوار کتنی گذار وادیوں سے گزرنا پڑا ہوگا، اس لئے کہ کلاسیکی رنگ میں شعر کہنے والے مجروح کی غزلوں میں رفتہ رفتہ وہ آہنگ پیدا ہوتا ہے جو انہیں ترقی پسند غزل کا نقیب بنا دیتا ہے ـــــ

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا، وہ جاوداں بنتا گیا

بادی النظر میں اس شعر کو تعلّی کے زمرے میں رکھا جاتا ہے اور بڑے بڑے نقادوں نے بھی اسے مجروح کا بڑبولاپن گردانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے ایک لطیف اشاراتی نظام کا استعمال کرکے زندگی کے ایک بنیادی تجربے کی ترجمانی کی ہے ۔ دراصل شعر کے اشارتی معنی کو سمجھنے کے لئے پڑھنے والے کی ذہنی سطح کا اسی ذہنی بلندی پر ہونا ضروری ہوجاتا ہے جس سطح سے شاعر نے اپنے ایک جذبے کو تعمیم بخشی تھی۔

اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ جگر مرادآبادی سیاسی اور دوسرے وقتی

موضوعات پر شاعری کو وقت کا ضیاع تصور کرتے تھے، مجروح، جگر صاحب کے اعتراض کے حوالے میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ جیسی تخلیقات، صدیوں سے زندہ ہے جبکہ وہ شاہان پرشکوہ جنکی مدح میں یہ قصائد لکھے گئے تھے، جزو خاک ہوکر فراموش کر دئیے گئے ہیں بدھ مت، ہندوستانیوں میں شاید ہی کہیں نظر آئے لیکن اجنتا کی مصوری آج بھی مرجع خلائق ہے اور مہاتما بدھ کے فلسفے کی مبلغ ہے، اجنتا کی لازوال فنکاری کو دیکھ کر شاعر کے جذبات میں تموج پیدا ہوتا ہے اور وہ خارجی منظر کو تخیل کی مدد سے شعر میں ڈھال دیتا ہے، اور یہ اشارہ کردیتا ہے کہ زادب صرف آفاقی صداقتوں اور کائناتی حقیقتوں کو موضوع بنانے سے لازوال نہیں ہوتا بلکہ اگر گریزپا صداقتیں بھی ادب کا موضوع بنیں تو ایسا ادب بھی لازوال ہوسکتا ہے لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ان عصری صداقتوں کو ایک سچے فنکار کا قلم چھوئے [1] لہذا شعر میں (میں) کی ضمیر فنکار کے لیے استعمال ہوتی ہے مجروح اس قسم کے اشعار کے توسط سے ہمیں یہ بھی احساس دلاتے ہیں کہ (سماجی مقصد کے بغیر بڑا آرٹ پیدا نہیں ہوسکتا)

شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

(ایک لفظ، ایک آواز (ایک اضافت اور ترتیب الفاظ ایسی نہیں جو دیر تک نہ گونجتی ہو، تصویر یہ بنتی ہے

جرم ثابت ہوا، سزا سنائی جاچکی شاعر کو سولی پر ٹانگنے کے لئے لائے ہیں، اسے باندھ دئے گئے ہیں، اپنے جرم پر فخر ہے اور دنیا سے جانے جانے آخری لمحوں میں اسے یہ یقین ہے کہ جس مشن کے لئے وہ سولی پر چڑھایا جارہا ہے، اس مشن کی فتح قریب ہے، اندھیری رات ہے، چاروں طرف دشمنوں، انقلاب دشمن طاقتوں کا ہجوم ہے، شاعر ان کے نرغے میں ہے، اس اندھیرے میں ظلم کی اس آندھی اور (نرغۂ راہزن) میں سناٹا ہے، کہ ناگہاں دور سے ایک پکار سنائی دیتی ہے، اس

---

۱ ڈاکٹر عصمت جاوید

پکار میں شاعر کو اپنا نام سنائی دیتا ہے، نرغہ کرنے والے چاروں طرف تختے کی بلندی سے نیچے (دار دار) کے سامنے بہت پست سطح پر کھڑے ہیں، وہ ایک دوسرے ہی کو دیکھ سکتے ہیں، دور سے پکارنے والے کو نہیں دیکھ سکتے صرف پکار سن سکتے ہیں۔ شاعر جسے پھانسی کے تختے کی بلندی پر چڑھایا جاچکا ہے، وہ سن بھی سکتا ہے اور دیکھ بھی سکتا ہے، چونکہ حواس انتہائی تناؤ اور شدت کے عالم میں ہیں، وہ کچھ زیادہ ہی سن رہا ہے، زیادہ دور تک دیکھ رہا ہے، پکار سن کر اس کی امیدوں میں جان پڑجاتی ہے کہ کاروان سحر جس کے ارمان اور جس ہوائی میں اس کی جان لبوں پر آپہنچی ہے، وہی کاروان سحر، ٹھیک راہ زن کے عقب میں نمودار ہوا ہے، پھانسی کا تختہ اب اس کی نظر میں ساری ہیبت کھو دیتا ہے، وہ ایک پکار، میرے نام کی پکار، یہ میری سرفروشی، یہ کفن بر دوشی رات رائیگاں نہیں گئی — آخر کاروانِ سحر آپہنچا، میرا یقین سچ نکلا۔

کمزور شاعر اگر منظر کی تصویر کشی پر قادر بھی ہوجاتا تو پکارتا، ٹھہرو، پھانسی کا پھندا ڈھیلا کرو، اے نرغۂ راہ زن، ٹھہر، اب تجھے پھانسی دی جائے گی، میرا کارواں، فتح مندوں کا کارواں آپہنچا، وہ دیکھا مگر مجروح نے، دیکھ لو، کہہ کر، سحر نہ ہو، کہہ کر، منظر (کو) منظر پر اپنے تاثر کو، اس خاص زمانے کو، اس کی اسپرٹ کے ایک ایک کیفیت کو نہایت فنکارانہ خلوص کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔'[1] مجروح کے اس شعر کو سننے کے بعد غزل کی اساس عشق کو "اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا" کہنے کی جرأت کس میں ہوسکتی ہے؟

• • •
• •
•

---

۱ ظ انصاری

کتابی دُنیا

ڈاکٹر ذاکر حسین

(پروفیسر محمد مجیب، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی)

تبصرہ از

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

زیر تبصرہ کتاب «ڈاکٹر ذاکر حسین» ایک سوانح عمری ہے جس کو پروفیسر محمد مجیب صاحب جیسے ایک نامور دانشور، ممتاز عالم اور ہردلعزیز قلمکار نے حکومت ہند کے اس وقت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر وی کے آر وی راؤ کی ایما پر تالیف کیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے قریبی احباب میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب اور محمد مجیب صاحب نے اپنے طور پر، اپنے اسلوب میں، اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا ہے اور انکی پروقار شخصیت کا جائزہ و تجزیہ اور نقد و تبصرہ کیا ہے جو ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ بہرکیف، پروفیسر مجیب صاحب نے اس قابل قدر سوانح حیات پر قلم اٹھانے سے قبل ہی اپنے «دیباچہ» میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ «اس میں یعنی (ڈاکٹر ذاکر حسین) کی سوانح حیات میں عصری واقعات میں سے صرف ان ہی باتوں کا ذکر کیا ہے جو ذاکر صاحب کی زندگی اور ان کے کارناموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سب تقریریں حذف کردیں جنکا ان کی سوانح عمری سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔»

پروفیسر مجیب صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی شخصیت، سیرت، ذہانت اور انسانیت پر بڑے دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے اور ان کے بلند کردار کی گرم جستجو اور انکی شیریں بیانی کی نرم گفتگو کی حسن و خوبی وضاحت کی ہے اور اس طرح سوانح حیات میں ذاکر صاحب کے علم کی گہرائی، بیان کی دل نشینی اور بصیرت کی گیرائی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حقیقت میں ذاکر صاحب ایک

حیرت انگیز شخصیت کے مالک ہیں اور اس سے ایک معلم کی محبت، ایک مفکر کی بصیرت، ایک مدبر کا وقار، ایک مصلح کا کردار اور ایک انسان کی شان مجیب صاحب کی اس سوانح سے اجاگر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب (١٨٩٧ - ١٩٦٩ع) نے ١٩١٢ع میں اول محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، بعد میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک رہے، ١٩٤٨ع میں مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کی ذمہ داری سنبھالی، ١٩٥٧ع میں بہار کے گورنر کی حیثیت سے کام کیا اور ١٩٦٢ع میں نائب صدر جمہوریۂ ہند اور ١٩٦٧ع میں صدر جمہوریۂ ہند کے بلند عہدے پر فائز ہوئے۔ ایسی باکمال شخصیت اور عالمانہ بوقلموں جسکا علم ہمہ جہت اور جس کی معلومات ہمہ رنگ ہو بلکہ جنکی علمی معلومات سے ان کی خدمت کے ایک اہم وسیلہ اور انسانیت کے نیک جذبہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مجیب صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے خاندانی پس منظر کے تعلق سے خاندانی روایتوں اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعمیر میں انکے زبردست حصہ کو واضح کیا ہے، وہ مسلم یونیورسٹی کو ہمیشہ مادر علمی کا درجہ دیتے رہے، تعلیم کے تصورات اور بنیادی تعلیم پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات و افکار کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ بعد میں ان کے پرآشوب زمانے کا ذکر کیا ہے اور انکی علمیت، دیانت اور قابلیت کے ساتھ ان کی انسانیت کے پیش نظر بہار کے گورنر، نائب صدر اور جمہوریۂ ہند کے صدر کی حیثیت سے ان کے محاسن اور خوبیوں کے ساتھ انکے کمالات کو بھی اجاگر کیا ہے جن کی بدولت وہ ایک بلند پایہ دانشور، ایک قابل قدر مصنف، ایک ممتاز کارکن اور ایک پرکشش انسان کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں مختصر یہ کہ مجیب صاحب نے اپنی اس ڈاکٹر صاحب کی سوانح میں اس بات کو بالخصوص واضح کیا ہے کہ وہ ایک مسلمان سے مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستانیوں سے ایک ہندوستانی کے روپ میں ملتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک اسلامیت اور وطنیت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر میدان

میں کامیاب رہے اور لوگ ان کے گرویدہ ہوگئے۔

ہم پروفیسر مجیب صاحب کو ان کی اس کتاب پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں اور جناب ایس اے رحمٰن، ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا (دہلی) کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اچھے گیٹ اپ اور خوبصورت طباعت سے اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا اردو کتابوں کی اشاعت و طباعت میں یوں ہی پیش پیش رہیگا۔

قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیاں

تبصرہ از

ڈاکٹر حامداللہ ندوی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب قرۃ العین حیدر کی بارہ منتخب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان بارہ کہانیوں کے نام ہیں ١۔ قلندر ٢۔ کارمن ٣۔ فوٹوگرافر ٤۔ جگنوؤں کی دنیا ٥۔ ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی ٦۔ کہرے کے پیچھے ٧۔ جسٹ بسٹ ٨۔ سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات ٩۔ روشنی کی رفتار ١٠۔ ڈالن والا ١١۔ اکثر بھگے کی ہنسی ١٢۔ اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو۔

ان کہانیوں کی ادبی، ثقافتی اور فنی اہمیت کو سمجھنے کے لئے قرۃ العین حیدر کا نام کافی ہے، وہ اردو اور انگریزی کی ایک جانی مانی خاتون فنکار ہیں، انہوں نے دنیا بھر کا سفر کیا ہے، زندگی کا بہت ہی وسیع تجربہ رکھتی ہیں اور وہ جو کچھ لکھتی ہیں ان کے پیچھے اُن کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے علاوہ اُن کی اپنی ثقافتی اور تاریخی معلومات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے، اردو میں انہوں نے زیادہ تر ناول لکھے ہیں جن میں "آگ کا دریا" اور "کارِ جہاں دراز

ہے، کافی مقبول ہوئے، انہوں نے کہانیاں کم لکھی ہیں اور جو بھی لکھی ہیں، زبان و بیان اور فنی خوبیوں کی عمدہ مثال ہیں

ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمہ نگاری، پس منظر اور انداز بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ناول نگار ان ضروری عناصر کی مدد سے زندگی کے حقائق کا تجزیہ کرتا ہے، اور عام طور پر ناولوں میں کسی خاندان، کسی قبیلہ، کسی قوم اور کسی ملک کی معاشرتی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی ہوتی ہے۔

کہانی میں یہ بات نہیں ہوتی، وہ افراد کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو لے کر آگے بڑھتی ہے، پرانی کہانیوں میں مقصد، پلاٹ اور کردار نگاری کو اہمیت دی جاتی تھی، مگر نئی کہانیوں میں اِن کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، کہانی کار اِن واقعات کو اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں ایک خاص ادبی چاشنی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے، اگر اس کی کسی کہانی میں کوئی مقصد یا کوئی کردار ابھر کر سامنے آجائے تو یہ اس کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہوتی۔

قرۃ العین حیدر کا شمار جدید اردو ادب اور اُس کے نمائندہ فنکاروں میں ہوتا ہے، وہ بھی اپنی اِن کہانیوں میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو اُن کے اپنے پس منظر کی روشنی میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں مگر چونکہ اُن کے مشاہدات وسیع، تجربات گوناگوں اور انداز بیان حقیقت پسندانہ ہوتا ہے اس لئے قاری اُن کی ہر کہانی میں ایک نئے مشاہدہ، ایک نئے پس منظر کو پاکر کھو سا جاتا ہے اور اِن کہانیوں میں اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے

اس مجموعہ کی بعض ابتدائی کہانیوں میں، ان کے اپنے ماحول اور پس منظر کی اجنبیت کے باوجود، اُن کے کرداروں کی نمایاں خصوصیات ہمیں اپنی طرف متوجہ کئے بنا نہیں رہتیں، قلندر، کارمن اور ہولوگرافر کے کردار کچھ ایسے ہی ہیں، گو یہ کردار مغربی ماحول اور یوروپی تہذیب کے پروردہ ہیں مگر ، قلندر، کی آزاد روی، کارمن کی خوش خلقی اور ہولوگرافر کی استقامت، وضع داری اور

مایوس کن انجام ہندوستانی ماحول میں پائے جانے والے بعض کرداروں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اِس لئے ہم اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

اسی طرح بعض کہانیوں میں مختلف ثقافتوں کی رنگا رنگ خصوصیات کی بڑی خوبی اور باریکی سے عکاسی کی گئی ہے، چنانچہ اُن کی کہانی، حسب نسب، ایک عام مسلم گھرانہ اور اس کی روزمرہ زندگی کے مختلف گوشوں پر سے پردہ اٹھاتی ہے تو سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات، میں فادر گریگری اور بی بی فلورا کے مکالمات، عیسائی ثقافت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو ہندوستان کی مسلم معاشرت کی طرح پاکستان کی مسلم معاشرت کا بھی کافی تجربہ ہے چنانچہ اِس مجموعہ کی آخری کہانی (اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو) میں انھوں نے ہندوستانی مسلم معاشرت کے ساتھ ساتھ پاکستانی مسلم معاشرت کا بھی خوب نقشہ کھینچا ہے، اِس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ دو ملکوں کے نام الگ ہیں مگر مسلم معاشرت دونوں جگہ ایک سی ہے۔ اس میں فرق کرنا آسان نہیں۔

اِس مجموعہ کی ساری کہانیوں کا ماحول نسوانی ہے، کردار نسوانی ہیں، زبان اور محاورے نسوانی ہیں اور ساری فضا نسوانی ہے۔ اور چونکہ قرۃ العین حیدر خود بھی اِن کہانیوں کا ایک حصہ ہیں اس لئے اِن کہانیوں کے ماحول کے تنوع کے باوجود ہر جگہ ان کی اپنی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

* * *

Edited by Prof. Nizamuddin S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director, Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute, Bombay-400 001
Pudlished by Mr Abdul Majeed Patka, B. Com (Hons)
General Secretary, Anjuman-i-Islam, Bombay-400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay-400 008

مقاله

اسلامیات

اصلاحی، ضیاء الدین

- دو سیمینار

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۵، ۳۸۹ - ۳۹۲)

اپریل ۱۹۹۵ع میں دو سیمینار ہوئے تھے، ایک انجمن ترقی اردو، ہند، کے زیر اہتمام دہلی میں (۱) علامہ شبلی۔ شخصیت اور فن، پر اور دوسرا (۲) جامعہ کاشف العلوم، اورنگ آباد کے زیر اہتمام ادب میں سفر ناموں کی اہمیت، پر۔ یہ اِن دونوں سیمیناروں کی رپورٹ ہے۔

بدیع الزماں

اقبال اور حسین ابن منصور حلاج

(آموزگار جلگاؤں، فروری ۱۹۹۵ع، جلد ۱۴، شمارہ ۲، ص ۱۸ - ۲۱)

منصور حلاج کے حالات زندگی، اور اُن کے فلسفۂ تصوف کا جائزہ اقبال کے اشعار کی روشنی میں۔

بزمی قریشی

ملک احمد بن پیر محمد الفاروقی   شیخ چاند بی اے

الاحمد آبادی

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۵، ص ۳۲۵ - ۳۴۵)

ملک احمد بن پیر محمد کے حالات زندگی، اور ان کی تصانیف کا جائزہ۔

سگرد ہنکے (Sigrid Hunke) (مصنف)
محمد ثناء اللہ عمری (مترجم)

یوروپی علوم کا عرب ورثہ

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۴، ص ۳۴۶ - ۳۶۵)

Dr Sigrid Hunke کا تعارف اور اُن کے ایک مقالہ کا ترجمہ جس میں انھوں نے سائنسی علوم کے سلسلے میں عربوں اور جرمنوں کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

سید لطیف حسین ادیب

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا عربی کلام

(معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۵، ص ۳۷۹ - ۳۸۸)

نیاز بریلوی کے عربی کلام کا تعارف۔

رسالہ وصال گنج احمد

(معارف اعظم گڑھ، اپریل ١٩٩٥ ع، جلد ١٥٥، شمارہ ٤، ص ٢٨٢ ـ ٢٨٩)

رسالہ وصال، شیخ گنج احمد کے ایک عربی مخطوطہ کا تعارف، جس کا ایک نسخہ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے۔

عبدالرؤف خان

تاریخ گوئی میں لفظ یحییٰ کے عدد

(معارف اعظم گڑھ، اپریل ١٩٩٥ع، جلد ١٥٥، شمارہ ٤، ص ٢٧٠ ـ ٢٨١)

ان تاریخ گوئی میں بعض حروف کے اعداد پر اختلاف اور اس کا حل لفظ یحییٰ کے اعداد کی روشنی میں

طارق سجاد

سول سروسز اور مسلمان

(آموزگار جالگاؤں، مئی ١٩٩٥ع، جلد ١٣، شمارہ ٤، ص ١٢ ـ ١٧)

سول سروسز کے امتحانات کا تعارف اور اس میں مسلمانوں کے حصہ کا ذکر

قاضی اطہر مبارکپوری

ابو ہاشم خالد بن یزید اموی

(معارف اعظم گڑھ، اپریل ١٩٩٥ ع، جلد ١٥٥، شمارہ ٤، ص ٢٤٥ ـ ٢٦٩)

خالد بن یزید اموی کے حالات زندگی اور اُن کے علمی و اخلاقی اوصاف کا ذکر۔

قریشی، زبیر

جواہر الفقہ پر ایک نظر

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ١٩٩٥ ع، جلد ٤٥، شمارہ ١، ص ١ ـ ١٥)

قاضی نور الدین فائق، مصنف مخزن الشعراء کی ایک اور کتاب جواہر الفقہ کا تعارف۔

محمد صابر خان

علی بن ابن الطبری کی فردوس الحکمۃ میں آیورویدک پر ایک مقالہ

(معارف اعظم گڑھ، مارچ ١٩٩٥ ع، جلد ١٥٥، شمارہ ٣، ص ١٦٥ ـ ١٨٥)

الطبری کی فردوس الحکمۃ کا تعارف۔ دوسری قسط۔

ندوی، شہاب الدین

رکوۃ اور اس کے اجتماعی نظام کی اہمیت

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۵ء، جلد ۱۵۵، شمارہ ۶، ص ۴۰۵-۴۲۵)

رکوۃ کے اجتماعی نظام پر سیر حاصل بحث، قرآن و حدیث اور عمل صحابہ کی روشنی میں۔

ادبیات

آصفی، عبدالباری

مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانی

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۵ء، جلد ۱۵۵، شمارہ ۶، ص ۴۳۷-۴۴۶)

مولانا فاروق چریاکوٹی کے حالات زندگی اور اُن کے زیر سایہ شبلی کی تعلیم و تربیت کا ذکر۔

اختری ضیائی

برطانیہ اور یورپ میں اردو اساتذہ کی کانفرنس

(اخبار اردو، اسلام آباد، اپریل ۱۹۹۵ء، جلد ۱۲، شمارہ ۴، ص ۹-۱۱)

والتھم فارسٹ کالج، لندن میں ۲۸ جولائی ۱۹۹۴ء کو "یورپ اردو کا گہوارہ" کے موضوع پر ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا، یہ اسی کی رپورٹ ہے۔

ادارہ

گوشۂ کیفی اعظمی

(سب رس حیدر آباد، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء، جلد ۵۷، شمارہ ۱، ۲، ۳، ص ۲۴-۳۶)

اس گوشہ میں کیفی پر حسب ذیل دو تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

مغنی تبسم: کیفی اعظمی کا شعری سفر
راشد آذر: کیفی اعظمی کا شعری آہنگ

گوشۂ محمد اکبر الدین صدیقی

(سب رس حیدر آباد، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء، جلد ۵۷، شمارہ ۱، ۲، ۳، ص ۴-۹)

اس گوشہ میں اکبر الدین صدیقی پر، محمد علی اثر، وقار خلیل اور محمد خلیل احمد صدیقی کے تین تاثراتی مضامین شامل ہیں۔

ادیب، سید لطیف حسین

حضرت شاہ نیاز احمد کا عربی کلام

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ٦، ص ۴۴۷-۴٦۵)

مضمون کی دوسری قسط، شاہ نیاز احمد کے عربی کلام کا متن، ترجمہ کے ساتھ۔

اکبر حیدری کشمیری

سر محمد اقبال اور سر سید علی امام

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ فروری ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ٦۰، ص ۲-۳)

سر علی امام کے حالات زندگی اور اقبال سے اُن کے تعلقات کا ذکر۔

کلام اقبال کے اصل مآخذ اور
اقبال کا نادر و نایاب کلام

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۰ مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۰، ص ۱-۲)

اقبال کا غیر مدون کلام جو آج تک مختلف کتابوں میں شائع ہوچکا ہے اس کا ذکر اور مزید کلام کے حوالے۔

کلام اقبال کے اصل مآخذ اور
اقبال کا نادر و نایاب کلام۔

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۸)

مضمون کی تیسری اور آخری قسط۔

انجینیئر، اصغر علی

اردو تنقید۔ نئی سمت، نئی قدریں

(شاعر بمبئی، جلد ٦٦، شمارہ ۱، ص ۲۰-۲۲)

ہر دور میں ادبی تنقید کی سمت بدلتی رہی ہے۔ اس پس منظر میں آج کی ادبی تنقید کا ایک مختصر سا جائزہ۔

انصاری، اسلوب احمد

اقبال اور فنون لطیفہ

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۸، ص ۹-۲۲)

اقبال کے کلام میں فنون لطیفہ کی ترجمانی جگہ جگہ ملتی ہے۔

انصاری طیب

عہد محبوبی میں اردو نثر کا ارتقا

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جون ۱۹۹۵ع،

سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے حالات، اردو سے متعلق۔

عہد محبوبی میں اردو نثر کا ارتقاء

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۴، ص ۲ ـ ۳)

مضمون کی تیسری قسط محبوبی دور کے چند مزید نثر نگاروں کا تذکرہ۔

عہد محبوبی میں اردو نثر کا ارتقاء

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جولائی ۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۵، ص ۲ ـ ۳)

مضمون کی چوتھی اور آخری قسط۔

انصاری طیب

اورنگ آباد بعہد آصفیہ اور اردو نثر کا آغاز و ارتقا

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۴۵، شمارہ ۱، ص ۳۲ ـ ۴۵)

نوابان آصفیہ کے عہد حکومت میں اورنگ آباد میں اردو نثر کا جو فروغ ہوا، اس کی تاریخ۔

انیس اشفاق

قائم کی غزل

جلد ۵۴، شمارہ ۲۲، ص ۸)

حیدر آباد میں سکندر جاہ کے عہد حکومت سے لے کر عہد ناصری تک اردو نثر کا جو ارتقا ہوا اس کا جائزہ۔ پہلی قسط۔

عہد محبوبی میں اردو نثر کا ارتقا

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ جون ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۳، ص ۲ ـ ۳)

مضمون کی دوسری قسط، ناصر الدولہ

(شب خون الہ آباد، مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۱، ص ۳۳ـ۴۴)

قیام الدین قائم کی غزلوں کا ادبی و لسانیاتی تجزیہ

تسلیم غوری بدایونی

اردو صحافت میں بدایون کا حصہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۱۵ مئی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۹، ص ۸)

یہ مقالہ کی پہلی قسط ہے، اس میں ۱۸۵۲ ع سے ۱۹۱۹ ع تک بدایوں سے جاری شدہ اخبارات و رسائل کا جائزہ ہے۔

چاولہ، ہری چرن

ناروے کی اردو فضا

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۴، ص ۸)

ناروے میں بسنے والے اردو بولنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا ذکر اور اردو کے سلسلہ میں اُن کی سرگرمیوں کا جائزہ

چشتی، شاہد الحق

دفتر پریشاں کے دو اہم نسخے

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۴۵، شمارہ ۱، ص ۱۶-۳۱)

«دفتر پریشاں» ناسخ کے ایک دیوان کا تاریخی نام ہے۔ اس مضمون میں اس کا تعارف اور اس کے دو نسخوں کا موازنہ ہے

ناسخ لکھنوی اور اصلاح زبان کی تحریک

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جولائی ۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۸، ص ۲)

ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک کا جائزہ۔

حقانی القاسمی

ندوی طوفان کی شعری دنیا کا ایک سفر

(آجکل دہلی، مئی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۱۰، ص ۷-۱۲)

ندوی طوفان کے حالات زندگی اور اُن کلام کا تعارف،

دسنوی عبد القوی

سہیل صدیقی مرحوم- غنچۂ ناشگفتہ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جولائی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۳۶، ص ۸)

بھوپال کے ایک طالب علم سہیل صدیقی کی شہادت کا ذکر اور اردو زبان و ادب سے اس کی دلچسپیوں کا جائزہ۔

کس سے خالی ہوا جہاں آباد

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۸، شمارہ ۸، ص ۴۵-۵۲)

مالک رام کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار، ادبی اور شخصی مطالعہ کی روشنی میں

دسنوی، سید شہاب الدین

عطیہ - اقبال اور شبلی

(ہماری زبان نئی دہلی، شبلی پر خصوصی پیش کش، ۱۵-۲۲ اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد

۵۴، شمارہ ۱۵۔۱۶، ص ۶۔۷)

عطیــــہ کے ساتھ اقبال اور شبلی کی دلچسپیوں کا جائزہ، تاریخی حقــائق کی روشنی میں۔

دیویندر اسر

ادبی فکر کا نیا گلوبل ماڈل
(یعنی ادب کو یہاں سے دیکھو)

(شب خون الہ آباد، مئی ۱۹۹۵ ع، جلد شمارہ ۱۸۳، ص ۹۔۱۳)

اُن مفروضات کا تجزیہ جو گلوبل ادبی فکر کے تصور کے پیچھے کارفرما ہیں۔

راهی، رام پرکاش

مہاراج حیرت۔ شخص اور شاعر

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ مئی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۸، ص ۸)

حیرت کے حالات زندگی اور اُن کی شاعری کا ادبی و فنی جائزہ۔

سلیم شہزاد

فکشن کی تنقید اور علوی کا علم علامت

(شب خون الہ آباد، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۲۹، ص ۴۵۔۵۰)

اردو ناول اور افسانوں کے تعلق سے علوی کے انتہاپسندانہ خیالات کا تجزیہ۔

سید شاہ عقیل

اردو شاعری میں تلمیح کا استعمال

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۴۵، شمارہ ۱، ص ۴۶۔۵۸)

تلمیح کی تعریف اور اردو شاعــــری میں اس کے استعمال کی وضاحت۔

سید یحییٰ نشیط

اردو کی متصوفانہ حمدیہ شاعری

(معــارف اعظم گـڑھ، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۴، ص ۲۹۰۔۳۰۱)

تصــــوف کی وضــاحت اور اردو کی متصوفانہ شاعری کا تعارف۔

سائیں سچا، خالد سہیل مترجم

شمالی یورپ میں اردو

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جولائی ۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۵، ص ۸)

جـــــرمنی، ہالینڈ، ناروے، ڈنمارک، سویــــڈن میں آباد ہنــــدوستانیوں اور پاکستانیــوں کا ذکر اور اردو کے سلسلہ

میں اُن کی سرگرمیوں کا جائزہ

شمالی یورپ میں اردو

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ جولائی ۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۶، ص ۲-۳)

مذکورہ مضمون کی دوسری اور آخری قسط۔

سید حامد

علامہ شبلی نعمانی - عالم و ادیب

(ہماری زبان نئی دہلی، خصوصی پیش کش ۱۵-۲۲ اپریل ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۵-۱۶، ص ۲-۳)

شبلی کی شخصیت اور فن پر ایک سرسری نظر۔

شمیم طارق

دوہا، ثقافت اور فرہنگ

(آجکل دہلی، مئی ۱۹۹۵ع، جلد ۵۳، شمارہ ۱۰، ص ۱۳-۱۶)

دوہا کی فنی، ادبی اور ثقافتی اہمیت کا جائزہ

صدیقی ظفر احمد

علامہ شبلی نعمانی - مختصر حالات زندگی

(ہماری زبان نئی دہلی، شبلی پر خصوصی پیش کش، ۱۵، ۲۲ اپریل ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴ شمارہ ۱۵، ۱۶، ص ۱۰۹)

شبلی کے حالات زندگی مختصراً، واقعات و حقائق کی روشنی میں۔

صدیقی محمد علی

اردو کے بین الاقوامی رسائل کا کردار

(شاعر بمبئی، جلد ٦٦، شمارہ ۱، ص ۷-۱۳)

اردو کے بین الاقوامی کردار کا جائزہ، برصغیر کے باہر۔

صدیقی انیس

کرانک میں اردو صحافت کا نقش اول قاسم الاخبار

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جون ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۱، ص ۲)

قاسم الاخبار کا تفصیلی جائزہ۔

عابدی رفیعہ شبنم

مراٹھی شاعری میں عورت کا تصور

(کتاب نما نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۳، ص ۲۷ ـ ۳۲)

مراٹھی شاعری نے اپنے مختلف ادوار میں عورت کا جو تصور دیا ہے اس کی تفصیل

عصمت جاوید

مرید ہندی

(کتاب نما نئی دہلی، اگست ۱۹۹۵ ع، جلد ۳۵، شمارہ ۸، ص ۲۳ ـ ۳۰)

ڈاکٹر نعیم الدین کی کتاب "مرید ہندی" پر تبصرہ، اقبالیات میں ایک قابل توجہ اضافہ کی حیثیت سے

صبر بہرانچی

سنسکرت، شعریات اور رومانیت

(آجکل دہلی، مئی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۳، شمارہ ۱۰، ص ۳ ـ ۶)

سنسکرت شاعری اور اس میں رومانوی عناصر کی نشاندہی، تاریخ کی روشنی میں

سنسکرت شعریات اور شاعری

(شب خون الہ آباد، مئی ۱۹۹۵، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۳، ص ۲۵ ـ ۳۵)

سنسکرت کے متعدد ماہرین شعریات کا تعارف، تاریخی پس منظر کے ساتھ۔

غلام مصطفی خان

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۸ مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۰، ص ۳)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا ذکر۔

فاروقی شمس الرحمٰن

کارگاہِ نیرنگ "ساحری"
شاہین صاحب قرانی

(شب خون الہ آباد، اپریل ۱۹۹۵ ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۲، ص ۱۹ ـ ۳۰)

داستان امیر حمزہ، کی جلدوں کا تعارف اور تجزیہ، اور ان کی تاریخ اشاعت

فریدی، قمر الہدی

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ـ ادبی و لسانی اہمیت

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۴، شمارہ ۳، ص ۲۴ـ۲۷)

سر سید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تعارف۔

قاسمی، شاہد اسلام

ادبی تنقید کی معنوی حیثیت
(عربی ادب کے حوالے سے)

(برہان دہلی، فروری ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۶، شمارہ ۲، ص ۱۵-۲۴)

عربی ادب کے پس منظر میں ادبی تنقید کی معنوی اہمیت کا جائزہ، قسط ۱

ادبی تنقید کی معنوی حیثیت
(عربی ادب کے حوالہ سے)

(برہان دہلی، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۶، شمارہ ۳، ص ۱۳-۱۸)

عربی ادب کے پس منظر میں ادبی تنقید کی معنوی اہمیت کا جائزہ قسط ۲

قاصی افضال حسین

ادب میں مابعد جدید کیا ہے

(شب خون الہ آباد، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۲۹، شمارہ ۱۸۱، ص ۹-۱۷)

جدیدیت کی وضاحت اور اردو میں اس اصطلاح کے استعمال کا پس منظر۔

قرواں، ڈی اے، پیرس

کلام اقبال میں مسیحی اصطلاحات

(آجکل دہلی، اگست ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱، ص ۱۶-۲۰)

کلام اقبال میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور مغربی زبانوں کی اصطلاحات کے علاوہ، مسیحی اصطلاحات کا بھی استعمال ہوا ہے انہیں کی نشاندہی اس کے پس منظر کے ساتھ کی گئی ہے۔

قیوم خضر

مہاتما ناول پر ایک منصرانہ نظر

(کتاب نما نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۳۵، شمارہ ۳، ص ۵۳-۶۲)

عبدالصمد کے نئے ناول (مہاتما) کا تفصیلی جائزہ

گوریکر، نظام الدین، ایس

علامہ شبلی نعمانی اور اُن کی فکر و نظر

(ہماری زبان نئی دہلی، شبلی پر خصوصی پیش کش، ۱۵-۲۲ اپریل ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۶،۱۵، ص ۳-۵)

شبلی کے فکر و نظر کا جائزہ، اس کے تاریخی پس منظر کی روشنی میں۔

عبدالمغنی

صنفِ افسانہ کی تشکیل

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۲، ص ۱)

اردو میں افسانوں کی نشو و نما کا جائزہ۔

محسن بھوپالی

ہائیکو کی ہیئت کا مسئلہ

(شاعر بمبئی، جلد ۶۶، شمارہ ۶، ص ۲۰ - ۲۲)

ہائیکو ایک جاپانی صنف سخن ہے، جس نے اردو میں بھی مقبولیت حاصل کرلی ہے، مضمون میں اس کی ہیئت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے

ندوی، حامد اللہ

داؤدی بوہرہ اور اُن کی لسان الدعوۃ

(معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۳، ص ۱۸۶-۲۰۱)

داؤدی بوہروں کی عربی رسم خط میں لکھی جانے والی گجراتی زبان کا لسانی جائزہ دوسری قسط۔

ندوی سید حبیب الحق

جنوبی افریقہ میں اردو کا فروغ

(معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۳، ص ۲۱۲-۲۲۳)

جنوبی افریقہ میں اردو کے فروغ کی تفصیلات تاریخی پس منظر کے ساتھ

وحید الدین

کیرالا میں اردو

(آموزگار جلگاؤں، جولائی ۱۹۹۵ع، جلد ۱۳، شمارہ ۷، ص ۹-۱۰)

کیرالا کے اسکولوں اور کالجوں میں اردو زبان کی تعلیم، اور اس سے متعلق سرگرمیوں کا ذکر۔

وحید اشرف کچھوچھوی

اقبال کی فارسی شاعری پر ایک اجمالی نظر

(معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۱۵۵، شمارہ ۲، ص ۲۰۲-۲۱۱)

اقبال کے فارسی کلام کی روشنی میں اُن کے مذہبی افکار کا جائزہ۔ دوسری

قسط۔

وزیر آغا

انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری

(شاعر بمبئی، جلد ٦٦، شمارہ ۲، ص ۵۔۱۱)

انشائیہ پر پچھلے تیس برس سے یہ بحث جاری ہے کہ وہ ہے کیا۔ مقالہ نگار نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

شخصیات

اکبر حیدری کشمیری

سروجنی نائڈو، اردو کی ایک عظیم سرپرست

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم مئی ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۷، ص ۱)

سروجنی نائڈو کے حالات زندگی اور اردو شعرا و ادبا سے اُن کے تعلقات کا جائزہ۔

جان، ایم، اے تاشقند

رحمان بردی محمد جانوف

(اخبار اردو اسلام آباد، جنوری فروری ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۲، شمارہ ۱۔۲، ص ۲۰۔۲۱)

تاشقند یونیورسٹی کے سابق اردو پروفیسر رحمان بردی محمد جانوف مرحوم کے حالات زندگی۔ جو زیادہ تر مقامی طلبہ میں استاد جی کے نام سے مشہور تھے اور بحیثیت استادِ اردو اُن کے کارناموں کا تعارف۔

سکسینہ ونریندر پرشاد

صباح الدین عمر

(ہماری زبان نئی دہلی، یکم جون ۱۹۹۵ ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱۱، ص ۸)

صباح الدین کے حالات زندگی۔

صدیقی عادل

مولانا شوکت علی

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ ۱۹۹۵ ع، جلد ۱۴، شمارہ ۳، ص ۱۰۔۱۳)

مولانا شوکت علی کے حالات زندگی۔

قاسمی شریف حسین

مرقع دہلی میں مذکور چند مغنیوں کے

حالات زندگی پر نئی روشنی

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جون ۱۹۹۵ ع ، جلد ۵۴ ، شمارہ ۲۴ ، ص ۱)

درگاہ قلی بیگ کی (مرقع دہلی) میں اٹھارویں صدی کے چند مشہور موسیقی دانوں اور مغنیوں کا ذکر ہے ان کے مزید حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے .

ندوی ، محمد اجتباء

امام محمد بن عبدالوہاب

(البلاغ بمبئی، جون ۱۹۹۵ ع ، جلد ۵ ، شمارہ ۱۱ ، ص ۲۱-۲۵)

امام محمد بن عبدالوہاب کے حالات زندگی .

شیخ محمد بن علی سنوسی

(البلاغ بمبئی، جولائی ۱۹۹۵ ع ، جلد ۵ ، شمارہ ۱۲ ، ص ۳۲-۳۴)

شیخ سنوسی کے حالات زندگی.

محمد علی اثر

جناب محمد اکبر الدین صدیقی

جلد ۵۴، شمارہ ٦ ، ص ۸)

صدیقی صاحب کے حالات زندگی اور اُن کی وفات پر اظہار افسوس

عطش درانی

علامہ قاضی محمد اعلی بن علی تھانوی اور اُن کی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون

(معارف اعظم گڑھ ، جون ۱۹۹۵ ع ، جلد ۱۵۵ ، شمارہ ٦ ، ص ۴۲۵-۴۳٦)

(اسلامی دنیا کا عظیم اصطلاح نگار) محمد اعلی بن علی تھانوی اور اُن کی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون کا تفصیلی تعارف ، ڈاکٹر اسپرنگر کی فراہم کردہ معلومات کی مدد سے .

اکمل اجملی

شاہ میران جان الہ آبادی کے مشہور تذکرہ جارن الشعراء پر ایک نظر

(آجکل دہلی ، مئی ۱۹۹۵ ع جلد ۵۳ ، شمارہ ۱۰ ، ص ۱۷-۲۰)

شاہ میرنجان اور ان کے تذکرہ جارن الشعراء کا تعارف .

(ہماری زبان نئی دہلی ، ۸ فروری ۱۹۹۵ ع ، تجاوری محمد مشتاق

مرزا عبداللہ بیگ

(ہماری زبان نئی دہلی، ۲۲ جولائی ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۲۸، ص ۱)

مرزا عبداللہ بیگ کے حالات زندگی جن کی خوشنویسی کی غالب نے تعریف کی ہے۔

شافع قدوائی

بیانیہ عرصہ اور راجندر سنگھ بیدی

(آجکل دہلی، اگست ۱۹۹۵ع، جلد ۵۴، شمارہ ۱، ص ۱۱-۱۵)

جدید تر افسانوی تنقید میں بیانیہ عرصہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مضمون نگار نے اس نئی تنقید کی روشنی میں بیدی کی عظمت کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔

محمد عمر

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(برہان دہلی، فروری ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۶، شمارہ ۲، ص ۲۵-۳۱)

یہ مضمون کی ۱۸ ویں قسط ہے۔ اس میں پیٹر اور فرانسسکو پلسیرٹ کے مشاہدات کا حال درج ہے۔

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(برہان دہلی، مارچ ۱۹۹۵ع، جلد ۱۱۶، شمارہ ۳، ص ۲۰-۳۰)

مضمون کی ۱۹ ویں قسط، پلسیرٹ کے مشاہدات کا مزید خلاصہ۔

مرزا حامد بیگ

فرانز کافکا کا جہاں

(شاعر بمبئی، جلد ۶۶، شمارہ ۳، ص ۵-۸)

جرمن ادیب کافکا کی زندگی اور کارناموں کا جائزہ۔

• • •

نوائے ادب ، بمبئی

FORM · IV – ROLL NO : VIII

رجسٹریشن نمبر ۳۲۰۰۹/۵۰

Registration No 32009/50

مقام اشاعت	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نوعیت اشاعت	:	ششماہی
نام پرنٹر	:	جناب عبدالمجید پاٹکا ، بی کام (آنرز)
قومیت		ہندوستانی
پتہ		انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پبلشر قومیت پتہ		ایضاً
نام ایڈیٹر		پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے ، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی (۱)
نام پتہ مالک رسالہ		ایضاً

میں عبدالمجید پاٹکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پاٹکا

● ● ●

All remittances be sent & correspondence be made to
Prof N S Gorekar, MA, PhD, DLitt
Director
Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute
92 Dadabhoy Nowroji Road, Bombay 400 001

●

ANNUAL SUBSCRIPTION

Inland : Rs fifty ● Foreign : £ 10

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

- لمعات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو اسیر (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

- اردو مراٹھی شبدکوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مصنفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈو ایرانین ریلیشنز۔ کلچرل اسپیکٹس (مصنفہ)
- انجمن اسلام صد سالہ تقریبات کی روداد (مرتبہ)
- مہاراشٹرہ میں اردو کا مقام (مرتبہ)

جناب عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

نقطے اور شوشے مصنفہ ڈاکٹر عابد پشاوری

مخطوطات جامع مسجد بمبئی مرتبہ ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما مرتبہ محترمہ رقیہ انعامدار

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے فروری ۱۹۴۷ع میں الحاق ہوا)

اغراض و مقاصد

۱ پوسٹ گریجویٹ تعلیم و تحقیق کا انتظام کرنا
۲ تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد کرنا
۹ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

• • •

نوائے ادب، بمبئی

(۱۹۵۰ع)

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

(سال میں دو بار اپریل اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

خصوصیات

۱ اردو ومتعلقہ زبانوں و ادبیات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو ودیگر متعلقہ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر نقد وتبصرے

(سالانہ چندہ : ۵۰ روپیے)

•

نوائے ادب کے مدیران

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۵۰ سے ۱۹۵۵)
ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (۱۹۵۶ سے ۱۹۶۷)
جناب عبدالرزاق قریشی (۱۹۶۸ سے ۱۹۷۵)
پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر (۱۹۷۶ سے جاری)

REGISTRATION NO . 32009/50

NAWA-E-ADAB

(Bi-annual)

VOLUME . XXXXV
OCTOBER
1995

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001